صدیقِ کاملؓ

Madam Bawa

ABDUL WAHEED.

مصنفہ

عباس محمود العقّاد

مترجم

منہاج الدین اصلاحی

ناشر

ایم۔ ثناء اللہ خاں اینڈ سنز

۲۶ ریلوے روڈ۔ لاہور

بار اوّل .... ایک ہزار

سن اشاعت .... مارچ ۱۹۵۷ء

قیمت چار روپے آٹھ آنے

طابع

انشا پریس۔ لاہور

ناشر

ایم۔ ثناء اللہ خاں اینڈ سنز ۲۶ ریلوے روڈ۔ لاہور

فہرست

مقدّمہ

"عبقریۃ محمدؐ" اور "عبقریۃ عمرؓ" اور اس قسم کی دوسری کتابوں کے مقدمات میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے، اس کا یہاں بھی اعادہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ ہمارا مقصود یہ نہیں ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کی سوانح حیات مرتب کر کے قاری کے سامنے پیش کئے جائیں۔ محض وقائع نگاری ہمارا موضوع نہیں ہمارا مقصود تو یہ ہے کہ حضرت صدیقؓ کا نفسیاتی تجزیہ اس انداز اور اس رنگ میں منظرِ عام پر لایا جائے کہ قاری کو اس شخصیت کی گہرائی تک اترنے اور اس کو اپنے حقیقی روپ میں دیکھنے کی کوئی دشواری نہ پیش آئے۔ اس لئے واقعات و حالات کو تو صرف اس حد تک ہاتھ لگایا گیا ہے جس حد تک اصل مدعا تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔ واقعات غیر معمولی بھی ہو سکتے ہیں اور معمولی بھی۔ لیکن کسی واقعہ کا معمولی یا غیر معمولی ہونا ہمارے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت کا مستحق نہیں۔ ایک معمولی سا واقعہ اگر اپنے اندر کوئی نفسیاتی اشارہ رکھتا ہے، تو وہ ہماری نگاہ میں بڑے بڑے

واقعات سے زیادہ اہم، زیادہ عظیم اور مقدم سمجھا جانے کے قابل ہے۔ بلکہ یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ایک معمولی اور بظاہر حقیر سی بات جو واقعات کے درمیان کہیں ضمناً آجاتی ہے اگر مذکورہ بالا وصف کی حامل ہے، تو تاریخ کے پیمانہ میں اس کا وزن چھوٹے بڑے دیگر واقعات کے مقابلہ میں زیادہ ہوگا۔

اس قسم کے تجزیہ کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ شخصیت کی تصویر گری یوں کی جائے کہ وہ اجمال و تفصیل میں حقیقی اور اصل کے مطابق ہو۔ ہم اس بات کے قائل نہیں کہ اصل تصویر پر اس قدر مصنوعی روغن چڑھا دیا جائے کہ اس کے صحیح خدو خال دب کر رہ جائیں۔ اور دیکھنے والے کے لئے شخصیت کے حقیقی نقوش سے آشنائی حاصل کرنا ناممکن ہو جائے۔

تصویر کو حسین و جمیل بنانے کے لئے اس پر مصنوعی رنگ لیپ دینا علیحدہ بات ہے اور اس تصویر کی عظمت کا اعتراف کرا لینا دوسری بات ہے۔ اگر کوئی شخص حضرت صدیق رضؓ کی کامیاب تصویر گری کرنا چاہتا ہے، تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تصویر میں حسن و جمال کا وہی رنگ بھرے، جو اصل شخصیت کی پوری طرح نقاب کشائی کرتا ہو۔ اور آہی نفسیاتی خطوط کو ابھارے، جو دیکھنے والے کی نگاہ کے سامنے اصل ذات کو مجسم لا کھڑا کریں۔ یہی حقیقی تصویر گری ہے جو تعظیم و توقیر کی مستحق ہے۔ اس تصویر گری اور مصنوعی رنگ آمیزی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

ان صفحات میں ہم نے جو بھی فضائل حضرت صدیق کی طرف منسوب کئے ہیں، وہ عام طور پر مسلّم ہیں اور ان کے ماننے میں شاذ و نادر ہی کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے جناب صدیقؓ نے جو قابلِ تحسین کارنامے سرانجام دیئے ہیں ہم نے ان کو بلا کم و کاست ناظرین کے سامنے رکھ دیا ہے تاکہ اس کے پڑھنے سے یہ احساس پیدا ہو جائے کہ یہ دنیا کی ایک عظیم القدر شخصیت کی تصویر ہے۔

حضرت عمر بن خطابؓ کی شخصیت پر نظر ڈالئے، تو بھی آدمی اس شخصیت کی عظمت کے احساس تلے دب کر رہ جاتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے سے کافی حد تک الگ اور مختلف ہیں۔ جو نقوش ایک میں ابھرے نظر آتے ہیں، ضروری نہیں کہ دوسرے میں بھی وہ آپ کو نظر آئیں۔ حقیقی تصویر گری کی خوبی تو یہی ہے کہ ایک انسان کو جب اسی جیسے دوسرے انسانوں کی صف میں کھڑا کر دیا جائے، تو اس کی تصویر پکار کر کہے کہ میں فلاں کا عکس ہوں۔ اور مجھ میں فلاں کمال یا خوبی ہے، جو دوسروں میں موجود نہیں۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ سیرت نگاری میں منفی پہلوؤں کا ذکر ضروری نہیں۔ مثال سے اس کو یوں سمجھئے کہ جب آپ کسی ایسے شخص کی ملکیت ظاہر کرنا چاہتے ہوں جو دس مکانوں کا مالک ہو تو آپ صرف اتنا بتائیں گے کہ وہ دس مکانوں کا مالک ہے۔ آپ کے لئے ضروری نہیں کہ وہ آدمی مزروعہ زمین، بنک بیلنس، کارخانوں اور سرکاری وظائف کا مالک نہیں صرف

مکانوں کا ذکر کر دینے کے بعد اگر آپ خاموش ہو جائیں تو آپ پر یہ الزام نہیں عائد کیا جا سکتا کہ آپ نے شخص مذکور کی ملکیت بیان کرنے میں پردہ داری یا تلبیس سے کام لیا ہے۔

شخصیتوں کے کردار کی مثال بھی بس ایسی ہی ہے۔ ایک شخصیت جس کردار کی مالک ہے اگر آپ اس کا صحیح صحیح نقشہ کھینچ دیتے ہیں، تو آپ کی صداقت پر صرف اس وجہ سے کوئی حرف نہیں آ سکتا کہ آپ نے اس شخصیت کے ان اعمال وکردار کی طول وطویل فہرست کیوں نہ تیار کی، جن سے اس کا دامن خالی تھا۔

ہم نے تاریخ کی بے لوث، مخلص اور محسنِ انسانیت شخصیتوں کی سوانح نگاری میں جو طریقہ اختیار کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ جس تعظیم وتوقیر کی مستحق ہیں، اُس کا ضرور اعتراف کرنا چاہیے۔ اور صرف یہی نہیں کہ ہمیں دل کھول کر ان کی تعظیم وتوقیر کا اعتراف کرنا چاہیے بلکہ کمالِ فن کے ساتھ ان کی تصویر گری بھی ہمارے فرائض میں داخل ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ سیرت نگاری کا یہ طریقہ اس دور میں گذشتہ ادوار کی بہ نسبت کہیں زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔ کیونکہ اٹھارہویں صدی عیسوی سے لے کر اب تک مسلسل کچھ ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں کہ ان اصول کی خلاف ورزی کو قابلِ فخر تصور کیا جانے لگا ہے۔ ایسا بعض اوقات

تو بغیر کسی محرک کے غیر شعوری طور پر یا محض جہالت و نادانی کی وجہ سے ہوتا رہا ہے۔ اور بعض اوقات جان بوجھ کر یہ راہ اختیار کی گئی۔

اس صورت حال کی ابتدا اس وجہ سے ہوئی کہ نشاۃ ثانیہ کے زمانہ میں علماء مذہب اور علماء سائنس کے مابین جو آویزش شروع ہوئی تھی، اُسے صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا۔ اس آویزش سے لوگ نادانی کی بناء پر یہ سمجھ بیٹھے کہ نئی عملی روشنی نے گذشتہ زمانوں کے مصلحوں اور بانیانِ ادیان و مذاہب کے کارناموں کو لغو اور بے معنی قرار دے دیا ہے۔ اس غلط فہمی کی وجہ سے اصلاح کا حقیقی کام کرنے والے اور دعوت الی الخیر دینے والے بھی اُن نام نہاد علماء دین و مذہب کے زمرہ میں شامل کر دیئے گئے، جو مذہب کے نام پر ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے اور اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی بناء پر تہذیب و تمدن کے ارتقاء کی راہ میں سنگ گراں بن کر حائل ہو گئے تھے۔

لیکن اگر حقیقت پسندی سے کام لیا جائے اور تنگ نظری کو الگ رکھ کر دیکھا جائے، تو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ دین کے حقیقی علمبرداروں اور مصلحوں نے انسانیت اور دنیا کی فلاح و بہبود اور ترقی میں ناقابل فراموش حصہ لیا ہے اور انہوں نے تہذیب و تمدن کی وہ خدمات سرانجام دی ہیں کہ ان کی عظمت کے آستانہ پر سر نیاز نہ جھکانا احسان فراموشی ہے۔ انسانیت کے ان خادموں کو صرف اس وجہ سے نظروں سے گرا دینا کہ وہ آج کے ترقی کے زمانہ سے پہلے ہو

گذرے ہیں، قرین انصاف نہیں۔ بلکہ یہ چیز تو ان کی عظمت کو اور زیادہ لازوال بناتی اور اُن کو تعظیم و توقیر کا مستحق ٹھہراتی ہے، اس لئے کہ انہوں نے اس تاریک دور میں کام کیا جب راہیں کٹھن تھیں۔

جو لوگ دین اور سائنس کا صحیح شعور رکھتے ہیں، ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کا وجود انسانیت کے ارتقاء کے لئے کس قدر ناگزیر اور ضروری ہے۔ سائنس اگر انسان کے لئے ذہنی غذا فراہم کرتی ہے تو دین اس کی روحانی تشنگی اور پیاس کی تسکین کا سامان مہیا کرتا ہے۔ سائنس کو اگر دین سے علیحدہ کر دیا جائے تو انسانی ارتقاء میں زبردست خلا پیدا ہو جائے گا، جس کو انسان اپنی کسی بھی علمی ترقی سے نہیں پاٹ سکتا۔

جمہوریت کا دور آیا، تو لوگوں نے جس طرح دین اور سائنس کے نزاع کو صحیح طور پر نہیں سمجھا، اسی طرح جمہوریت کو بھی صحیح طور پر سمجھنے سے قاصر رہے اس دور میں لوگ اس وہم میں مبتلا ہو گئے کہ شخصی آزادی ایک چھوٹے انسان کو بھی بڑے انسانوں کا ہم رتبہ بنا دیتی ہے اور قانونی مساوات فطری اور طبعی فرق و امتیاز کو بھی ختم کر دیتی ہے۔ اس دور میں ملوکیت، جو عظمت کا نشان سمجھی جاتی تھی، کے سر سے برتری کا تاج زبردستی چھین لیا گیا اور بالکل بجا طور پر چھین لیا گیا۔ معاملہ اگر یہیں تک رہتا تو کوئی شکایت نہ ہوتی لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اس اندھے سیلاب نے جہاں صدیوں کی پڑی ہوئی گندگی سے دنیا کو نجات

دی، وہیں اس کا نقصان دہ پہلو یہ ہے کہ اس کی لہریں ان فلک بوس محلوں سے بھی ٹکرانے لگیں جن کے سارے عناصر تعمیر عظمت کے خالص آمیزے سے ترکیب پذیر ہوئے تھے۔ کاخ امراد کو تو منہدم کیا ہی گیا تھا، حقیقی عظمت کے ایوانوں کو بھی ڈھا دینے کی کوشش کی گئی۔ اور جمہوریت اور مساوات کے نام پر ہر انسانی عظمت کا انکار کیا جانے لگا۔ دنیا کی بڑی شخصیتوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اور یہ مرض اس حد پر آکر رکا کہ جو لوگ صحیح معنوں میں تعظیم و توقیر کے مستحق تھے، اُن سے نفرت کی جانے لگی۔

اس کے بعد کمیونزم نے جنم لیا جس کی عمارت کی بنیاد ہی اس تصور پر قائم ہے کہ ہر ہیرو اپنی سوسائٹی اور ماحول کی پیداوار اور اس کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ سوسائٹی اور ماحول پر اس کا کوئی احسان نہیں۔ اس تصور نے یہ گل کھلایا کہ گذشتہ دور کی عظیم شخصیتوں کی تعظیم و توقیر لوگوں کی نظروں سے گر گئی۔ اور ان اجتماعی نظاموں کے عیوب اور خرابیاں نظروں سے اوجھل ہو گئیں جو ان شخصیتوں کے ظہور کی طالب ہوتی تھیں۔ چنانچہ کمیونسٹوں نے کسی ایسی شخصیت پر کیچڑ اچھالنے میں دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جس کی عظمت و توقیر سے ان کے نظریاتی مذہب پر زد پڑتی ہو۔ ان کی کم ظرفی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے شیکسپیئر اور اس جیسے دوسرے ڈرامہ نویسوں کے ڈراموں کے کرداروں تک کو مسخ کر ڈالا۔ شیکسپیئر کا مشہور ڈرامائی کردار ڈرامے میں ازمنۂ وسطیٰ کے ایک رنگین

مزاج شہزادے کے روپ میں پیش کیا گیا ہے، جو اپنے زمانے کے سماجی بندھنوں کا باغی تھا۔ مگر کمیونسٹ حضرات نے اس کردار کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ کردار جب روس میں سٹیج کیا گیا، تو لوگوں کی آنکھوں نے اس کو ایک ذلیل، مکار اور دھوکے باز کردار کی صورت میں دیکھا۔ یہ صرف اس لئے کہ ہملٹ ایک پرانے سماج کی یادگار تھا اور پرانی چیز قابل نفرت ہے۔

یہ اور اسی قسم کے متعدد دوسرے محرکات مل کر اپنا کام کرتے رہے جن کے زیر اثر لوگ بزرگوں کے سر سے ان کی عظمت کا تاج اتار پھینکنے میں اس حد تک بے باک ہو گئے کہ عدالتی زبان میں یوں کہئے کہ خود عظمت کو اپنا حقیقی مقام و مرتبہ واپس لینے کے لئے ان لوگوں کی صریح زیادتی کے خلاف "قانون ازالہ حیثیت عرفی" کا سہارا لینا پڑا۔

غور کیجئے کہ انسانیت اگر اپنے بڑوں اور بزرگوں کا حق نہیں پہچان سکتی تو اس سے کسی اور کے حق پہچاننے کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔ اور انسانیت کی قدر و قیمت کیا رہ جاتی ہے، اگر اس کا دامن عظمت سے خالی ہو جائے؟

اس لئے ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ انسانی عظمت فی الواقع جس تعظیم و توقیر کی مستحق ہے، اس میں بخل اور تنگ نظری سے کام نہ لیا جائے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ عظمت کو اجاگر اور نمایاں کرنے کے لئے اس قدر رنگ آمیزی بھی نہ کی جائے کہ اصل تصویر پر تصنع کا پردہ پڑ جائے اور دیکھنے

والا ذوقِ نظارہ کی تسکین کے سوا اس سے کوئی اور فائدہ حاصل نہ کر سکے۔ غیر واقعی حسن و جمال پیدا کرنا فن کی خوبی نہیں۔ فن کی خوبی تو یہ ہے کہ چہرے پر جو نقش نظر آئے، اس کی تصویر گری اس کمال سے کی جائے کہ اس کی سچی توقیر و عظمت سامنے آ جائے۔

ہمارے محترم اور محقق دوست احمد امین نے ڈاکٹر ہیکل پاشا کی کتاب "الصدیق" اور میری کتاب "عبقریہ عمر" پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک اہم مسئلہ اور باقی رہ جاتا ہے جس میں اہل قلم کے نقطہ ہائے نظر مختلف ہیں۔ وہ یہ کہ ایک عظیم انسان، خواہ کتنی ہی بڑی عظمت کا مالک کیوں نہ ہو، اس سے غلطیوں اور کوتاہیوں کا سرزد ہونا ضروری ہے، ورنہ وہ انسان انسان نہیں کہا جا سکتا۔ معصومیت صرف خدا کا حصہ ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک سوانح نگار کا فرض کیا ہے؟ آیا یہ کہ وہ جس شخص کے حالات قلمبند کر رہا ہے اُس کی زندگی کے ہر واقعہ اور ہر چیز کا تذکرہ بالتفصیل کرے اس کے اندر جہاں جہاں محاسن اور خوبیاں ہوں، اُن کو بھی سامنے لانا جائے اور جہاں کوتاہیاں اور کمزوریاں ملیں، اُن کو بھی نظرانداز نہ کرے تاکہ لوگ مثبت اور منفی دونوں رخوں کے سامنے آ جانے کے بعد خوبیوں کو اپنا لیں، اور کمزوریوں کو رد کر دیں؟

یا ایک سوانح نگار کا فرض صرف اتنا ہے کہ عظمت کے پہلوؤں کو

اجاگر کرے اور غلط پہلوؤں کی یا تو تاویل کر دے یا ان کی مدافعت میں محاذ قائم کر کے کھڑا ہو جائے؟ میں ذاتی طور پر پہلی رائے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس لئے کہ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کی زندگی بھی ہمارے سامنے یہی نمونہ پیش کرتی ہے۔ لیکن دونوں فاضل مؤلف دوسری رائے کی طرف زیادہ مائل نظر آتے ہیں۔"

ہمارے فاضل دوست نے جو کچھ فرمایا ہے ہم اس سے متفق ہیں۔ ہم یقیناً دوسری ہی رائے کی طرف مائل ہیں لیکن ہم نے اپنے اس میلان کو ان حدود کے اندر محدود کر رکھا ہے جن کا ذکر ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ اور ہمارا یہ خیال ہے کہ ہمارے فاضل دوست بھی اس میلان کی خوبی کے شعوری یا غیر شعوری طور پر معترف ہیں۔ چنانچہ وہ انہیں دونوں کتابوں کے تبصرے کی ابتداء میں ارشاد فرماتے ہیں:- ......

...... یورپ والوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے روشن پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے اور ان کی عظمت کے ہر گوشہ کی چھان بین کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات وہ غیر مستحسن مبالغہ کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ اور کسی کمزوری یا کوتاہی کی وجہ جواز تلاش کرنے کی دھن میں قیاس کے گھوڑے دوڑانے لگتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے اندر جوش عمل، ذوق و شوق اور زندگی کی امنگ پیدا ہو۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ہم نے اپنے بزرگوں کے کارناموں پر پردے ڈال دیئے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے نوجوان اور ہمارے عوام ان کے کردار کا جلوہ دیکھنے اور کوئی فائدہ حاصل کرنے سے قاصر ہیں۔"

یہ پردے مشرق میں زیادہ ہیں اور خاص طور پر موجودہ دور نے ان کو اور دبیز کر دیا ہے۔ یہی پردے ہمیں دعوت دے رہے ہیں کہ ہم بڑھ کر انہیں چاک کر دیں تاکہ ہمارے بزرگوں کی صحیح اور حقیقی عظمت منظر عام پر آسکے۔

نام ونسب

خلیفۂ اول تاریخ میں متعدد ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں۔ آپ کے دو ناموں "ابوبکر" اور "الصدیق" کو بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ آپ کے دو نام اور ہیں: "عتیق" اور "عبداللہ"۔

کہا جاتا ہے کہ آپ ان ناموں اور لقبوں سے جاہلیت اور اسلام دونوں زمانوں میں مشہور رہے۔ زمانہ جاہلیت میں آپ کو "صدیق" کے لقب سے اس لئے شہرت حاصل ہوئی کہ عرب قبائل کے جھگڑوں اور تنازعات میں تصفیہ کے فرائض انجام دینے میں آپ کی صداقت شعاری مسلم تھی۔ قتل و خون کے جن واقعات کا ہونا عربوں کی زندگی کا معمول تھا، ان میں آپ ثالث مقرر کئے جاتے اور آپ کے فیصلے بے چون وچرا تسلیم کر لئے جاتے۔ کوئی دوسری شخصیت اگر یہی کام انجام دیتی تو قریش کے سرکش قبائل اس کے فیصلے کو حتمی نہ تصور کرتے اور جانبداری کا الزام لگا کر فیصلے سے برائت کا اعلان کر دیتے، مگر آپ کے فیصلوں

کے ساتھ اس قسم کا ناخوشگوار واقعہ کبھی پیش نہیں آیا۔

(آپ "عتیق" کے لقب سے اس لیے مشہور ہوئے کہ اس لفظ کے معنی حسین وجمیل کے ہیں اور آپ خوبصورتی کا مجسمہ تھے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس لفظ کی اصل "عتق" ہے جس کے معنی آزاد کرنے کے ہیں۔ اس لحاظ سے عتیق کے معنی آزاد ہوئے۔ یہ نام آپ کی والدہ نے منتخب کیا تھا اور اس لیے منتخب کیا تھا کہ ان کے یہاں کوئی بچہ زندہ نہیں رہ پاتا تھا۔ جب آپ پیدا ہوئے تو وہ آپ کو گود میں لیے ہوئے قبلہ رو ہوئیں اور دعا کی کہ "اللھم ان ھذا عتیقک من النار فھبہ لی"۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کے والدین کے تین بیٹے عتیق، معتق اور معیتیق تھے۔ یہ تینوں نام فال نیک کے طور پر رکھے گئے تھے جس کے اندر یہ عائیہ مفہوم تھا کہ یہ موت کے پنجہ سے آزاد رہیں۔)

بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ دورِ جاہلیت میں عبدالکعبہ کے نام سے مشہور تھے لیکن یہی نام زمانۂ اسلام میں عبداللہ سے بدل دیا گیا۔

زمانۂ اسلام میں آپ کا لقب صدیق اس لیے باقی رہا کہ آپ نے حدیث اسراء کی بے چون و چرا التصدیق کی تھی۔ اور عتیق اس لیے باقی رہا کہ آنحضور نے آپ کو آگ سے آزادی کا مژدہ سنایا تھا۔

آپ اسلام اور جاہلیت کے ادوار میں جن القاب سے مشہور ہوئے بہت ممکن ہے کہ ان کی شہرت کا سبب وہی ہو جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ

آپ کی زندگی اور سیرت خواہ دورِ اسلام سے تعلق رکھتی ہو یا دورِ جاہلیت سے ان ناموں اور لقبوں میں کسی ایک کی بھی نفی نہیں کرتی۔

آپ عام فیل کے دوسرے یا تیسرے سال پیدا ہوئے۔ گویا آپ کی عمر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تقریباً دو سال کم تھی۔ آپ کے والد کا نام عثمان تھا مگر ابو قحافہ کی کنیت سے مشہور تھے۔ آپ کا اور آنحضور علیہ السلام کا نسب چھ پشت پر (مرۃ بن کعب پر) یک جا ہو جاتا ہے (آپ کے والدین قبیلہ تیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس خاندان کے مرد اپنی خوش خلقی اور تہذیب و ثقافت میں مشہور تھے اور عورتیں اپنی نسائیت اور نزاکت میں ضرب المثل تھیں۔ تیم کی لڑکیوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنے اس وصف کی وجہ سے اپنے شوہروں کو بستہ فتراک بنا لیتی تھیں۔)

غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ یہ قبیلہ مدتوں پہلے سے تمدنی انوار و برکات سے فیض یاب ہوتا رہا تھا۔ تجارت اس خاندان کا آبائی پیشہ اور مخصوص مشغلہ تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ کام حسنِ سلوک، نرم مزاجی، محبت و ہمدردی اور لین دین میں صفائی کی ہی بدولت کامیابی سے چل سکتا ہے۔ تجارت کا مزاج، تند مزاجی، بدمعاملگی اور بداطواری سے میل نہیں کھاتا۔

قبیلہ بنو تیم اپنی تمدنی اور معاشرتی زندگی میں جیسا بھی رہا ہو، بہر حال یہ مسلّم ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کا اپنا خاندان اور گھرانہ معاشرتی خوبیوں اور محاسن کی وجہ

سے عرب گھرانوں میں ممتاز مقام رکھتا تھا۔ حضرت صدیقؓ اور اُن کے والدینؓ اولادؓ کے درمیان جو گہرا رشتۂ الفت و محبت تھا وہ ہمیں اس دور کے کسی دوسرے خاندان میں نظر نہیں آتا۔ حضرت ابوبکرؓ کے ایک صاحبزادے کا باپ کی مخالف پارٹی یعنی مشرکین کی صفوں میں شامل ہو کر جنگ کرنا بچپن کی فروگذاشت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، ورنہ اسلام لانے کے بعد باپ بیٹوں کے تعلقات میں کبھی ناخوش گواری پیدا نہیں ہوئی۔

ابو قحافہؓ نے اپنی زندگی ہی میں مکہ کے اندر اپنے بیٹے کو اس مہتم بالشان منصب پر دیکھا جس کا وہ اہل تھا۔ ہر طرف اسی کا طوطی بول رہا تھا۔ ہر سو اسی کی عظمت کا سکّہ چل رہا تھا۔ بیٹا بیعتِ خلافت لینے مکّہ آتا ہے، اندھا باپ اپنے دروازہ پر بیٹھا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بیٹا آیا ہے۔ باپ ملاقات کے لئے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ بیٹا اپنے کمزور اور اندھے باپ کو اٹھتے دیکھتا ہے، تو فوراً اپنی کھرط اونٹنی سے اچھل کر نیچے آجاتا ہے اور باپ کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ "والد بزرگوار! اٹھنے کی زحمت گوارا نہ فرمایئں۔" پھر آگے بڑھ کر باپ سے لپٹ جاتا ہے اور اس کی آنکھوں کو محبت کے بوسے دیتا ہے۔ بیٹا بھی اب نوجوان نہیں ہے۔ اس کی عمر تقریباً ساٹھ سال ہے مگر اس کے باوجود اس کو یہ گوارا نہیں کہ باپ اس کے استقبال کے لئے کوئی معمولی زحمت بھی برداشت کرے۔

(خلیفہ ایک روز ابو سفیان کے کسی غلط فعل پر برافروختہ ہو جاتے ہیں اور

ابوسفیان کی معذرت کے باوجود اُن کو ڈانٹتے جاتے ہیں۔ ابو قحافہ اپنے ملازم سے پوچھتے ہیں کہ

"میرا بیٹا کس کو ڈانٹ رہا ہے؟"

ملازم بتاتا ہے کہ "ابوسفیان کو۔"

ابو قحافہ بیٹے سے قریب ہو کر نہایت نرمی اور دوراندیشی کے لہجہ میں فرماتے ہیں "قحیق! تم ابوسفیان کو ڈانٹ رہے ہو۔ ایسا کرنا تمہاری عادت کے خلاف ہے"

ابوبکرؓ اور اُن کی معیت میں جو دوسرے صحابہؓ تھے، یہ سُن کر مسکرا پڑے پھر ابوبکرؓ نے باپ سے مخاطب ہو کر کہا "پدر محترم! اللہ تعالیٰ نے اسلام بھیج کر کچھ لوگوں کا مرتبہ بڑھا دیا ہے اور کچھ لوگوں کا مرتبہ گرا دیا ہے"

ایک باپ اپنے بیٹے کے لئے جس شفقت آمیز خیرخواہی کا جذبہ رکھتا ہے اس کا ثبوت اس صالح باپ نے اس وقت بھی دیا جب اُس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کی اطلاع پہنچائی گئی۔ اس نے خبر ملتے ہی کہا "حادثۂ عظیم!"

پھر اُس نے پوچھا "آپؐ کے بعد جانشینی کا منصب کس نے سنبھالا؟"

لوگوں نے بتایا "آپ کے بیٹے نے۔"

اُس نے پوچھا "کیا عبدمناف اور بنو مغیرہ اس کی جانشینی پر رضامند ہو گئے؟"

لوگوں نے کہا "ہاں! رضامند ہو گئے۔"

اُس نے کہا "جو چیز خدا عنایت کرنا چاہے، اُس کو کوئی نہیں روک سکتا اور جو چیز خدا چھین لینا چاہے اُس کو کوئی شخص دینے کی قدرت نہیں رکھتا۔"

اسی محبت آمیز خیر خواہی کا ثبوت اس صالح باپ نے اس وقت بھی دیا تھا جب بیٹے نے نبی علیہ السلام کی معیت میں ہجرت کی تھی۔ اس نے اپنے پوتوں سے پوچھا کہ "بیٹے نے رخصت ہوتے وقت تمہاری کفالت کے لئے کتنا مال و اسباب چھوڑا ہے؟"

اور شاید یہی محبت آمیز خیر خواہی تھی، جو اس باپ کی طرف سے اس وقت بھی ظاہر ہوئی جب بیٹا مشرکین کے پنجوں میں پھنسے ہوئے غلاموں کو اپنا مال پانی کی طرح بہا کر آزاد کرا رہا تھا۔

اُس نے بیٹے سے کہا "اگر تم مستقل سکونت پذیر غلاموں کو خرید کر آزاد کرتے، تو یہ ضرورت کے وقت تمہاری پشت پناہی کرتے۔"

بیٹے نے کہا "پدر محترم! مجھے خدا کی نوازش کے سوا کچھ بھی مطلوب نہیں۔"

یہ صالح باپ زندہ رہا اور اس کی زندگی ہی میں بیٹا اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔ جب بیٹے کی وفات کی اطلاع ملی، تو اس نے کہا "حادثہ عظیم! حادثہ عظیم!"

اس کے بعد اس نے پوچھا "اس کی جانشینی کا منصب کس نے سنبھالا؟"

لوگوں نے بتایا "عمرؓ نے۔"

اُس نے کہا، "وہی اس کی جانشینی کا مستحق و سزاوار ہے۔"
اس صالح باپ کی بہت سی خصوصیات بیٹے میں پائی جاتی تھیں بیٹے نے اپنی جد و جہد اور ذاتی صلاحیتوں کی بنا پر ان خصوصیات کو اور جلا بخش دی تھی۔

صدیقِ اوّل خلیفۂ اوّل

(ایک مشہور روایت میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شدید بیماری کی حالت میں تھے کہ اسی دوران آپ کے مؤذن خاص حضرت بلال رضؓ حاضر خدمت ہوئے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا، "ابوبکر رضؓ سے کہہ دو، نماز پڑھائیں"۔)

(حضرت عائشہ رضؓ وہاں موجود تھیں۔ انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ابوبکر رضؓ رقیق القلب انسان ہیں۔ اگر وہ آپ کی جگہ نماز پڑھائیں گے۔ تو لوگ اُن کی آواز نہ سن سکیں گے۔ اس لئے آپ اس کام کے لئے حضرت عمر رضؓ کو حکم فرمائیں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضؓ کی بات نظرانداز فرماتے ہوئے دوبارہ فرمایا، ابوبکر رضؓ سے کہہ دو نماز پڑھائیں"۔

حضرت عائشہ رضؓ نے حضرت حفصہ رضؓ سے اشارۃً آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم

کی خدمت میں درخواست کرنے کو کہا۔ حضرت حفصہؓ نے بھی یہ درخواست دہرا دی۔ آنحضرتؐ نے اس بار بار کی تکرار کے جواب میں فرمایا "تمہاری مثال اُن عورتوں کی سی ہے جن سے حضرت یوسفؑ کو سابقہ پڑا تھا۔"

حضورؐ نے تیسری بار فرمایا "ابوبکرؓ سے کہہ دو، نماز پڑھائیں!"

عبداللہ بن زمعہ کا بیان ہے کہ وہ اس وقت آنحضرتؐ کے پاس تھے اس کے بعد وہ ادائیگی نماز کے لئے مسجد گئے۔ مسجد میں حضرت ابوبکرؓ موجود نہ تھے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ آپ بڑھئے اور نماز پڑھائیے۔ اُن کے کہنے کے مطابق حضرت عمرؓ نے نماز پڑھائی شروع کر دی۔ آنحضورؐ نے جب تکبیر کہتے وقت حضرت عمرؓ کی آواز سنی، تو فرمایا "ابوبکرؓ کہاں ہیں؟ اللہ تعالیٰ اور مسلمانوں، دونوں ہی کو یہ بات پسند نہیں!"

اس پر حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن زمعہ کو لعنت ملامت کی اور کہا کہ "اے ابن زمعہ! تم نے میرے ساتھ یہ کیا کیا؟ میں نے تو یہ سمجھا تھا کہ تم نے آنحضورؐ کے فرمان کے مطابق مجھے امامت کرنے کو کہا تھا۔ اگر مجھے یہ غلط فہمی نہ ہوتی، تو میں نماز پڑھانے کے لئے ہرگز آگے نہ بڑھتا۔"

عبداللہ بن زمعہ نے کہا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کسی قسم کا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ میں جب مسجد میں آیا تو میں نے یہاں حضرت ابوبکرؓ کو نہیں دیکھا ان کی عدم موجودگی میں میں نے آپ ہی کو امامت کے لئے موزوں پایا۔"

اس روایت میں سب سے زیادہ تعجب خیز امر یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک حکم فرماتے ہیں اور حضرت عائشہ رضؓ اس حکم کے متعلق تردد فرماتی ہیں پھر یہ تردد ایک بار نہیں بلکہ متعدد بار ظہور پذیر ہوتا ہے۔

حضرت عائشہؓ کا یہ تردد کئی وجوہ سے تعجب خیز ہے۔

اس وجہ سے بھی تعجب خیز ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک حکم فرماتے ہیں اور حضرت عائشہ رضؓ اس کے بارے میں تامل اور تردد سے کام لیتی ہیں حالانکہ حضورؐ کا یہ فرمان نبی کی حیثیت سے تھا۔ علاوہ ازیں حضرت عائشہ رضؓ کو حضورؐ سے جو محبت تھی، وہ بھی مخفی نہیں۔

اس وجہ سے بھی تعجب خیز ہے کہ آنحضورؐ نے جو فرمان صادر فرمایا تھا، وہ کسی ایسی چیز کے متعلق نہ تھا، جو حضرت عائشہ رضؓ پر بارِ خاطر ہو۔ کیونکہ حضورؐ نے تو اس فرمان کے ذریعہ اُن کے والد کو اس باعزت مقام سے نوازا تھا جس سے سرفراز ہونا باعث صد افتخار تھا۔

سب سے بڑھ کر تعجب کا پہلو یہ ہے کہ اس تردد کا اظہار اس وقت کیا جاتا ہے جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم شدید کرب و بے چینی کی حالت میں مبتلا ہیں اور آپ کو آرام و سکون کی ضرورت ہے۔ ایسی حالت میں آنحضورؐ کو کوئی ذہنی اذیت و کوفت پہنچانا بڑا ہی عجیب و غریب نظر آتا ہے۔ حالانکہ ازواجِ مطہرات میں سب سے زیادہ حضرت عائشہ رضؓ آنحضرتؐ پر جان چھڑکتی تھیں۔ ان کو ایسے حالات میں حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے زیادہ خیال ہوا کرتا تھا اور وہ آپ کی سب سے زیادہ مزاج شناس تھیں۔

اس موقع پر یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ حضرت عائشہؓ عام حالات میں آنحضورؐ سے بات چیت اور بحث و تکرار کے معاملہ میں سب سے زیادہ بے باک اور جری واقعہ ہوئی تھیں۔ عام لوگ جس معاملہ میں آنحضورؐ کے سامنے لب کشائی کرنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتے تھے، حضرت عائشہؓ اس معاملہ کو نہایت خوش اسلوبی اور بے باکی کے ساتھ آنحضورؐ کے سامنے بیان کر دیا کرتی تھیں۔

اس کا سبب یہ تھا کہ وہ آنحضورؐ کی سب سے زیادہ مطیع فرمان تھیں۔ آپؐ جو بات بھی ارشاد فرماتے، وہ اس کی رمز اور گہرائی تک فوراً پہنچ جاتیں اور دل و جان سے اس کی اطاعت کرتیں۔ اسی بناء پر ان کو یہ اعتماد تھا کہ وہ آنحضورؐ سے آزادانہ گفتگو کرنے کے بعد بھی آپ کے غصہ اور ناراضگی سے محفوظ رہ سکتی ہیں۔

حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں یہ بلند مقام اپنے حسن و جمال کی بدولت نہیں بلکہ اپنی غیر معمولی ذکاوت و ذہانت اور معاملات کی سوجھ بوجھ کی وجہ سے کیا تھا۔

ان باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب ذرا غور فرمایئے کہ جس شخص کو حضرت عائشہؓ جیسی ذکاوت و ذہانت، بلند نظری اور معاملات کو صحیح طور پر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ملی ہو، وہ آنحضورؐ کے دور رس نتائج والے حکم اور خود اس

وقت کی نزاکت سے کس طرح بے خبر رہ سکتا ہے۔ اس لئے یہ بات بعید از قیاس ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اس موقع پر بے وجہ تردد کیا ہو گا۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس تردد کے پیچھے ایک نہایت اہم اور عظیم الشان سبب کارفرما تھا۔ اگر یہ محرک نہ ہوتا تو حضرت عائشہؓ یقیناً یہ تردد نہ کرتیں۔ اس محرک اور سبب کی اہمیت اور عظمت ہماری نظر میں اتنی ہے کہ ہم نے تاریخی روایات میں حضرت عائشہؓ کی ذہانت کے جتنے واقعات بھی پڑھے ہیں، ان میں یہ واقعہ جو اس نازک موقع پر تردد اور پس و پیش کی صورت میں ظاہر ہوا، سب سے الگ اور ذہانت کا شاہکار نظر آتا ہے۔

خلافت کے متعلق آج تک جو کچھ کہا گیا ہے اگر وہ سب کا سب ہمارے سامنے موجود ہو تو ہمیں یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری اور دقت پیش نہیں آنی چاہیئے کہ حضرت عائشہؓ نے اپنی نوعمری کے باوجود غیر معمولی ذکاوت و ذہانت، روشن نگاہی اور دور بینی سے بر وقت کام لے کر اپنے متعلق بعد میں پیدا ہونے والے کتنے ہی شکوک و شبہات کا ازالہ کر دیا۔ ساتھ ہی ہمیں یہ اندازہ لگانے میں بھی کوئی الجھن نہیں ہونی چاہیئے کہ رسول اللہؐ جس خاتون کی اتنی زیادہ ناز برداری فرمایا کرتے تھے اور جس کو اس قدر عزیز رکھتے تھے، وہ اسی قابل تھی کہ اُس کی اتنی ہی ناز برداری کی جائے اور اُس کو اسی طرح سر آنکھوں پر رکھا جائے۔

خلافت کے متعلق جتنے منہ اتنی باتیں کہی گئی ہیں۔

اس مسئلہ کے متعلق ایسی باتیں بھی کہی گئی ہیں جو جائز طور پر بہت سے افراد

کے ذہن ودماغ میں آسکتی ہیں۔ ایسی باتیں بھی کہی گئی ہیں جن کو تنگ ذہنیت والے ہی سوچ سکتے ہیں اور ایسی باتیں بھی کہی گئی ہیں جو ضدی اور ہیٹ دھرم آدمی ہی سوچ سکتا ہے یا ان کو سُن کر صاد کر سکتا ہے۔

اس مسئلہ کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی بیٹی کے ساتھ مل کر سازش کی اور اس طرح مسند آرائے خلافت ہوئے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں تین آدمیوں کی سازش کا ہاتھ تھا اور عائشہؓ نے اپنے مقام ومرتبہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان تینوں کا ہاتھ مضبوط کیا۔ اس دوسرے قول کے مطابق سازش کرنے والے ابوبکرؓ، عمرؓ اور ابوعبیدہؓ بن الجراح تھے۔ یہ لوگ سقیفہ بنی ساعدہ میں بروقت اس لئے پہنچ گئے تاکہ انصار کو اپنی مرضی کا امیر منتخب کرنے پر راضی کرلیں۔

یہ رائے رکھنے والے کہتے ہیں کہ سازش کرنے والے تینوں افراد نے اپنے طور پر یہ طے کر لیا تھا کہ پہلے ابوبکرؓ خلافت سنبھالیں گے، اس کے بعد عمرؓ اور پھر ابوعبیدہؓ۔ اس کا ثبوت یہ پیش کیا جاتا ہے کہ عمرؓ نے اپنی وفات کے وقت کہا تھا کہ اگر ابوعبیدہ بقید حیات ہوتے، تو میں زمام کار ان ہی کے سپرد کرتا کیونکہ وہ آنحضور علیہ السلام کے فرمان کے مطابق اُمت کے امین تھے۔

اس وہم باطل کو بعض مستشرقین نے کافی ہوا دی۔ اور اس لئے اسے مغربی قارئین میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

حضرت عائشہؓ اس لحاظ سے بڑی خوش نصیب ہیں کہ انہوں نے کسی اہم معاملہ میں آنحضورؐ کی مخالفت نہ کی اور جب کی تو اپنی قابل رشک ذہانت کی بدولت یہ ثابت کر دیا کہ کیوں وہ آنحضورؐ کی نگاہ میں اتنی عزیز تھیں اور کیوں انہوں نے اس قلب عظیم میں اپنے لئے اتنی وسیع جگہ پیدا کر لی تھی۔

حضرت عائشہؓ نے اس موقع پر تردد کر کے یہ دکھا دیا کہ اُن کی ذات ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ آئندہ ان کے متعلق جو رائے بھی قائم کی جائے گی، اس کی ذمہ داری اُن پر نہیں ہو گی۔ اُن کے تردد کا ایک سبب تو یہ تھا اور دوسرا سبب یہ تھا کہ خلافت کی دعویداری کی جڑ کٹ جائے، ورنہ آئندہ اس سے صدہا فتنے کھڑے ہو سکتے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انہوں نے اپنی برائت پر اس فرد (حضرت حفصہؓ) سے مہر تصدیق ثبت کروائی جس کی شہادت کے بعد اُن کی ذات کے متعلق کسی قسم کا کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔ انہوں نے حضرت حفصہؓ کو باقاعدہ طور پر باخبر کر دیا کہ وہ ابوبکرؓ کی امامت کے بارے میں کچھ دلچسپی نہیں رکھتیں۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں حضرت حفصہؓ ہی کو زیادہ شک و شبہ ہو سکتا تھا۔ ان کے والد حضرت عمرؓ ہی کا نام خلافت اور امامت کے سلسلے میں دوسرے درجہ پر آتا تھا۔ جیسا کہ عبداللہ بن زمعہ کے قول سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ "جب میں نے ابوبکرؓ کو نہیں دیکھا، تو میں نے سمجھا کہ آپ ہی امامت کے مستحق ہیں۔"

حضرت عائشہؓ کے اس تردد کا ایک فائدہ تو خود اُن کو پہنچا۔ وہ اس طرح کہ اُن کی ذات شک و شبہ سے بالاتر ہو گئی۔ دوسرا زبردست فائدہ اس تردد نے قوم کو پہنچایا۔ وہ اس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بار بار کے اصرار کی وجہ سے اپنی حتمی رائے ظاہر فرما دی جس کے بعد انتخاب کا کام بہت ہی آسان اور اختلاف و پراگندگی کا راستہ مسدود ہو گیا۔

ایک روایت میں ہمیں یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے اس تردد کا پس منظر یہ تھا کہ وہ یہ دیکھنے کی تاب نہیں رکھتی تھیں کہ آنحضورؐ کی جگہ کوئی اور امامت و سیادت کا منصب سنبھالے۔ پھر انہیں یہ بھی احساس تھا کہ عام لوگ جب اپنے محبوب نبیؐ کی مسند پر دوسرے کو دیکھیں گے، تو اسے نیک شگن نہیں سمجھیں گے۔

لیکن اگر یہ صحیح ہے اور ضرور صحیح ہے کہ حضرت عائشہؓ نے تردد اور پس و پیش فرمایا تھا، تو یہ کہنا زیادہ موزوں اور درست معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے اس تردد کے پیچھے اُن کی ذکاوت و ذہانت اور خلق عظیم کام کر رہا تھا نہ کہ بدشگونی کا جذبہ کیونکہ اُن سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ انہوں نے اس جذبہ کے تحت آنحضورؐ کو مرض کی شدت کی حالت میں تنگ کیا ہو گا۔ اور محض اس جذبہ کے تحت اپنے والد کو خلافت کے شرف سے محروم کر دینے کی سوچی ہو گی۔ پھر اُن سے یہ اُمید رکھنا بھی اُن کی شان کے منافی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس منصب کو اپنے والد کے لئے منحوس

سمجھتی ہوں، اسی منصب کے لئے حضرت حفصہؓ سے حضرت عمرؓ کے حق میں سفارش کرائیں۔ اس تفصیل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عائشہ نے جو تردد کیا تھا، دوسری توجیہات کے مقابلہ میں اس کی وہی توجیہہ زیادہ صحیح اور قرین قیاس ہے جو ہم نے کی ہے۔ اس توجیہہ کے بعد وہ حیرت واستعجاب باقی نہیں رہتا جو حضرت عائشہؓ کے اس بظاہر بے موقع تردد سے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔

تعجب حضرت عائشہؓ کے اس تردد پر نہیں بلکہ ان فرضی افسانوں اور بے سروپا باتوں پر ہے جو خلافت کو مزعومہ سازش کا شاخسانہ قرار دیتی ہیں۔ حالانکہ نہ تو ان قصے کہانیوں کی پشت پر کوئی تاریخی مستند دلیل ہے، نہ عقل سلیم انہیں تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے۔ اور نہ ان شرفاء اور خواتین کے اخلاق ہی سے اس کی توقع کی جاسکتی ہے جن کی طرف یہ نام نہاد سازش منسوب کی جاتی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت سے متعلق ہمیں جتنی روایات بھی ملتی ہیں ان میں سے کسی ایک سے بھی مذکورہ بالا موہوم افسانوں کی تائید نہیں ہوتی۔ اس قسم کا کوئی اشارہ ہمیں نہ تو اُن لوگوں کے کسی قول وفعل سے ملتا ہے جنہوں نے سب سے آگے بڑھ کر حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی، نہ ہی اُن لوگوں کے کسی قول وفعل سے اس قسم کا کوئی اشارہ ملتا ہے جنہوں نے بیعت کے معاملہ میں تاخیر والتوا سے کام لیا۔ اور نہ ہی اُن لوگوں کا کوئی قول وفعل اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے جنہوں نے زندگی بھر بیعت سے احتراز کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبّہ کا زمانہ ہو یا آپؐ کی وفات حسرت آیات کے بعد کا، دونوں ہی ادوار میں عام لوگ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ اور ابو عبیدہؓ کے اخلاق و اطوار سے جس حیثیت سے متعارف تھے، اُس سے کسی شخص کو اس وہم میں مبتلا ہونے کی گنجائش نہیں نکلتی کہ ان حضرات نے خلافت کے معاملہ میں آنحضورؐ کی زندگی میں کوئی سازش کی ہوگی۔ ان لوگوں کی پوری زندگی اس امر کی شاہد ہے کہ انہوں نے معاملاتِ زندگی میں سے کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا معاملہ آنحضورؐ سے چھپا کر نہیں رکھا۔

حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ کی دوران خلافت کی زندگی بھی دیکھ جائیے، آپ کو کسی مقام پر یہ شبہ تک نہ ہوگا کہ ان کے اندر حکمرانی یا اقتدار کی ہوس کا شائبہ تک موجود رہا ہو۔ ان دونوں کی بے داغ سیرتوں کے کسی گوشہ سے یہ وجہ جواز نہیں نکل سکتی کہ انہوں نے آنحضورؐ کے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے خیال کو بھی ذہن میں جگہ دی ہوگی۔ اس کے برعکس یہ ضرور ملے گا کہ ان حضرات کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنا گہرا عشق تھا، جہاں شک و شبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی ہے۔

جتنی تاریخی روایات ہم تک پہنچی ہیں، وہ سب کی سب یہ ماننے پر مجبور کرتی ہیں کہ خلافت کا معاملہ بغیر کسی سابق تدبیر یا سوچ بچار کے حالات کے اقتضاء کے مطابق خود بخود پیش آ گیا۔ اور اس معاملہ پر غور و فکر اور سوچ بچار اس وقت کیا

گیا، جب انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو گئے۔ تقریباً تمام روایات میں بالاتفاق یہی آتا ہے کہ آنحضورؐ نے جس وقت حضرت بلالؓ کو حضرت ابوبکرؓ کی امامت کا حکم دیا تھا، اس وقت حضرت ابوبکرؓ کسی قریبی مقام پر موجود نہیں تھے۔ بالفرض اگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عائشہؓ کے مابین کوئی خفیہ بات چیت یا سازباز ہوتی ہوتی، تو اس کو تکمیل کے مرحلہ تک پہنچانے کے لئے حضرت ابوبکرؓ کا مسجد یا آنحضورؐ کے دولت کدہ سے قریب ہونا ضروری تھا۔ ورنہ یہ سازش ناکام ہو جاتی اور معاملہ سازش کرنے والوں کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے ہاتھوں میں چلا جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ایسے وقت ہوئی جب آپ کے قریبی رفقاء کو اس کا وہم و گمان تک نہ تھا۔ آنحضورؐ کی حالت قدرے بہتر ہو گئی تھی۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے آپ سے رخصت کی اجازت طلب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "خدا کے فضل سے اس وقت آپ کی طبیعت ہماری تمنا کے مطابق ہے آج بنت خارجہ کی باری ہے۔ کیا آپ مجھے اس کے پاس شب باشی کی اجازت مرحمت فرماتے ہیں؟"

آنحضورؐ نے اُن کو اجازت دے دی اور وہ سخ (حضرت ابوبکرؓ کی لبستی کا نام ہے) چلے گئے۔

رہا حضرت عمرؓ کا معاملہ، تو آنحضورؐ کی وفات کی خبر سن کر اُن کے اوسان

جس طرح خطا ہوتے ہیں، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں آپ کی وفات کی بالکل توقع نہ تھی اور نہ ہی وہ اس جانکاہ خبر کے لئے ذہنی طور پر آمادہ تھے ورنہ وہ یہ خبر سن کر حواس باختگی کا شکار ہونے کی بجائے مزعومہ سازش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے تیاری شروع کر دیتے۔

ان حالات میں حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ کو خبر ملتی ہے کہ انصار آنحضورؐ کی جانشینی کا مسئلہ طے کرنے کے لئے سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوتے ہیں۔ دونوں حضرات آپس میں یہ طے کئے بغیر ہی کہ ان میں سے کون وہاں لوگوں کو پہلے خطاب کرے گا، وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کو یہ اندیشہ تھا کہ حضرت ابو بکرؓ اپنی فطری تند مزاجی کے باعث موقع پر کوئی سخت بات نہ کہہ دیں جو لوگوں کے لئے موجب اشتعال ہو۔ وہ یہ بھی فیصلہ نہ کر پاتے تھے کہ حضرت ابو بکرؓ سے ایسا فعل سرزد ہو جائے تو معاملہ پر قابو پانے کے لئے خود ان کو کیا کرنا چاہیئے۔ اسی طرح حضرت ابو بکرؓ کو حضرت عمرؓ کی جانب سے یہ خطرہ لاحق تھا کہ وہ اپنی معروف سخت گیر طبیعت سے مغلوب ہو کر کہیں بے جا شدت کا ارتکاب نہ کر بیٹھیں۔ اور اگر وہ اس طرح کی غلطی کر گذریں، تو ان کو بروقت ٹوک دینے کے بعد خود ان کو گفتگو کا آغاز کس طرح کرنا چاہیئے۔ اس پوری صورت حال میں ہمیں کہیں کسی خفیہ معاہدہ وغیرہ کا پتہ نشان نہیں ملتا۔

راستے میں ان دونوں حضرات کا حضرت ابو عبیدہؓ سے مل جانا ایک اتفاقی

امرثالث: ایک مشہور روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ سے ملاقات کے وقت اُن سے کہا کہ آپ اپنا ہاتھ بڑھائیے، میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق آپ اس اُمت کے امین ہیں۔"

حضرت ابوعبیدہؓ نے جواب میں کہا "میں جس وقت سے اسلام لایا ہوں، میں نے آپ کی جانب سے ایسی مضحکہ خیز بات سرزد ہوتے کبھی نہیں دیکھی۔ نبیؐ کے یارِ غار حضرت صدیقؓ کی موجودگی میں آپ میرے ہاتھ پر بیعت کرنے کا خیال کیوں کر ذہن میں لائے؟"

اگر یہ روایت صحیح ہے، تو ان تینوں اشخاص کی سازش کے اس مزعومہ کا کیا بنے گا۔ جو اپنی جگہ خود ایک من گھڑت سازش ہے۔ حضرت عمرؓ نے مذکورہ بالا گفتگو خواہ اس ارادے سے کی ہو کہ وہ فی الواقع حضرت ابوعبیدہؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے ہوں یا اس گفتگو کا پس منظر اس معاملہ میں حضرت ابوعبیدہؓ کا عندیہ معلوم کرنا ہو، دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت بھی ہو، ہر ایک صورت سازش کے احتمال کی کلی طور پر نفی کرتی ہے۔

جلیل القدر صحابہ بھی آنحضورؐ کی وفات کی خبر سن کر جب اس پریشانی میں پڑ گئے تھے اور آپ کی وفات سے پہلے مرض کے وقت بھی جب اُن کی یہ حالت تھی تو پھر مزعومہ سازش کی کب گئی؟ کوئی بھی صاحبِ عقل شخص یہ نہیں تسلیم کر سکتا کہ یہ

بلند پایہ صحابہ، جو آنحضورؐ کی رسالت پر دل وجان سے ایمان رکھتے تھے۔ آپؐ کے مرض سے پہلے آپ کی وراثت باہم تقسیم کرنے کے لئے کسی خفیہ سازش کا خاکہ تیار کرنے کی سوچ سکتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایسا کرنا ممکن تھا، تو پھر یہ بتایا جائے کہ سازش کرنے والوں کو آخر یہ اطمینان کیوں کر حاصل ہو گیا کہ قرآن کریم ان کے اس رازِ درون پردہ کو طشت از بام نہیں کر دے گا۔ اور وحی کے ذریعہ خلافت کے مسئلہ میں ان کی سازش کے خلاف فیصلہ نہیں دے دیگا۔ پھر ساتھ ہی ان کو یہ اطمینان بھی کیوں کر حاصل ہو گیا کہ آنحضورؐ اپنی وفات سے پہلے خلافت کے متعلق کوئی ایسی وصیت نہیں کر جائیں گے، جو ان کی سوچی سمجھی اسکیم کو خاک میں ملا دیگی۔

اس سلسلے کی ہر روایت کی چھان بین کرنے، ہر مفروضہ کا تجزیہ کرنے اور وہم وگمان کے ہر نشیب وفراز کا جائزہ لینے کے بعد جو بات واضح طور پر سامنے آتی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ یہ معاملہ جس صورت وقوع پذیر ہوا، اس کو اسی صورت ہونا چاہیے تھا۔ اس کے پس پردہ کوئی سکیم یا سازش کارفرما نہیں تھی (بقول حضرت عمرؓ حضرت ابو بکرؓ کی بیعت خود بخود اور اچانک عمل میں آئی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے خطرات سے امّت کو محفوظ رکھا۔)

معاملہ جس طریق پر انجام پذیر ہوا، اس کے لئے کسی تدبیر و تمہید اور اسکیم تیار کرنے کی ضرورت کیا تھی جب کہ اس کے بغیر بھی کوئی رکاوٹ پیدا ہونے کا اندیشہ تھا نہ امکان؟

حضرت ابو بکرؓ کے علاوہ دوسرا کون شخص تھا جو خلافت کی شرائط میں اُن سے اونچا مقام رکھتا ہو یا جو ہر نقطۂ نظر سے ان کے مقابلہ میں اس منصب کا زیادہ اہل ہو؟

وہ عمر کے معیار پہ پورے اترتے تھے۔ وہ قبولِ اسلام میں اوّلیت اور سبقت کا مقام رکھتے تھے۔ وہ نبیؐ کے یارِ غار تھے۔ اور وہ جلیل القدر صحابہ میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کے قرائن و آثار آنحضورؐ کے مرض موت سے چند سال پیشتر ہی نظر آ رہے تھے۔ آنحضورؐ نے اپنی زندگی ہی میں ان کو پہلا امیر حج بنا کر بھیجا اور خود مدینہ منورہ میں تشریف فرما رہے۔ یہ واقعہ ۹ھ کا ہے۔ راستہ میں ایسا اتفاق ہوا کہ حضرت ابو بکرؓ نے نماز صبح کے لئے لوگوں کو جمع کیا۔ عین اسی وقت انہوں نے ایک اونٹنی کی آواز سن کر نماز کچھ دیر کے لئے ملتوی کر دی اور فرمایا یہ آنحضورؐ کی اونٹنی کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج ادا کرنے کا ارادہ فرما لیا ہے۔ اگر واقعی آپؐ ہی کی سواری ہے تو ہم آپؐ کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ لیکن اونٹنی کے آنے پر معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ علی ابن ابی طالبؓ ہیں جو حضورؐ کی اونٹنی پر تشریف لائے ہیں۔

حضرت ابو بکرؓ نے ان سے دریافت کیا کہ "آپ امیر حج بنا کر بھیجے گئے ہیں یا قاصد کی حیثیت سے آئے ہیں؟"

حضرت علیؓ نے جواب دیا، "قاصد بن کر آیا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو سورہ براءت سنانے کے لئے مجھے بھیجا ہے۔"

جب لوگ مکہ معظمہ پہنچ گئے، تو حضرت ابو بکرؓ نے خطبہ دیا اور لوگوں کو مناسکِ حج بتائے اور حضرت علیؓ نے پوری سورۂ براءت پڑھ کر سنائی۔ پھر عرفہ کا دن آیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے خطبہ دیا، لوگوں کو مناسکِ حج کی تعلیم دی۔ اور حضرت علیؓ نے سورۂ براءت پڑھ کر سنائی۔

ایک دفعہ قبیلہ اوس کے لوگوں کے درمیان کسی معاملہ میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم صلح و صفائی کرانے کے لئے وہاں تشریف لے گئے۔ اور حضرت بلالؓ کو حکم فرما گئے کہ اگر نماز کا وقت آ جائے اور میں وقت پر نہ پہنچ سکوں، تو تم ابو بکرؓ سے کہہ دینا کہ وہ نماز پڑھا دیں۔

(بخاری نے جبیر بن مطعمؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک عورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آنحضورؐ نے اس کو دوبارہ کسی وقت حاضر ہونے کو فرمایا۔

اس عورت نے عرض کیا، "اگر میرے حاضرِ خدمت ہونے کے وقت آپ نہ ہوئے، تو کیا بنے گا؟"

شاید اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر میرے آنے کے وقت خدانخواستہ آپؐ اس دنیا میں موجود نہ ہوئے تو میں اپنی عرضداشت کس کے سامنے پیش کروں گی۔

آنحضورؐ نے فرمایا، "اگر میں اس وقت موجود نہ ہوا، تو ابوبکرؓ سے تمہارا مقصد پورا ہو جائے گا"

یہ متفق علیہ آثار اور ان کے علاوہ متعدد دوسرے شواہد جن میں کچھ صریح ہیں اور کچھ محتاج تاویل وتشریح، اس امر کی شہادت کے لئے کافی ہیں کہ حضرت ابوبکر کی خلافت کے قرائن بہت پہلے سے نظر آرہے تھے۔

اس قسم کے آثار کے علاوہ ایسے صریح اور متواتر آثار کی بھی کمی نہیں، جن سے واضح طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ اُس ماحول میں نسلی اور خاندانی عصبیت کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ نبوی دعوت نے معیار سیادت وقیادت یکسر بدل دیا تھا۔ رسول اللہؐ نے اپنے ہر قول وفعل کے ذریعہ جاہلی عصبیت کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے اور دنیوی سیادت وقیادت کا گھناؤنا پن واضح کرنے کے لئے جس قوت وطاقت کے ساتھ جہاد فرمایا، شاید اتنا زور کسی اور چیز پر صرف نہیں کیا۔ آپ کے مقدس نفس کو سب سے زیادہ دکھ اس بات سے ہوتا تھا کہ نبوت کو کوئی شخص ہاشمی خاندان کی حکومت کی تمہید سمجھ پائے۔ پوری تاریخ شاہد ہے کہ آپ نے مکہ ومدینہ یا ملک کے کسی اور حصے میں اپنے کسی خاندانی عزیز کو گورنری اور حاکمیت کے منصب پر مامور نہیں فرمایا۔ نسلی بت کا قلع قمع کرنے کے لئے آپ نے ابوسفیان سے رشتے ناطے قائم کئے۔ معاویہؓ کو اپنے کاتبوں میں جگہ دی اور جس دن مکہ فتح کیا گیا اپنے منادی کو یہ اعلان کرنے کا حکم فرمایا کہ جو شخص مسجد

(خانہ کعبہ) میں داخل ہو جائے گا، اُس کی جان و مال کی امان ہے اور جو شخص ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو جائیگا، اُس کا جان و مال بھی محفوظ رہے گا۔ یہ اعلان آپ نے اس لئے کر دیا تھا کہ بنی اُمیہ کے دلوں میں خاندانی عصبیت اور چپقلش کی وجہ سے بنو ہاشم کے خلاف جو نفرت پائی جاتی تھی وہ مٹ جائے اور لوگوں کے لئے یہ خیال کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، ایک خاندان کو دوسرے خاندان پر غلبہ دلانے یا ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ کا دست نگر بنانے کے لئے ہو رہا ہے۔

آنحضورؐ فرماتے ہیں۔ "زمامِ حکومت اس وقت تک قریش کے ہاتھ میں رہے گی، جب تک یہ لوگ دین کو قائم رکھیں گے۔ اس دوران جو بھی ان کو زیر کرنے کی کوشش کرے گا، ناکام ہو گا۔"

رسول اکرمؐ کے اس ارشاد میں قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ زمامِ حکومت بنو ہاشم کے ہاتھ میں رہے گی حالانکہ اگر آپ یہ کہنا چاہتے تو کوئی چیز مانع نہیں تھی۔

آنحضور علیہ السلام نے قریش کو حکومت کے معاملہ میں، خاندانی یا نسلی عصبیت سے متاثر ہو کر ترجیح نہیں دی بلکہ یہ ترجیح اس دُوررس سیاسی حکمت پر مبنی تھی جس کو ہر وہ رہنما ملحوظ رکھتا ہے جس میں عوامی مزاج کی تھوڑی سی سوجھ بوجھ بھی ہو۔ مکہ کی سیادت اس وقت قریش کے ہاتھ میں تھی اور مکہ ہی اسلام

کا مرکز و محور تھا۔ ظاہر ہے کہ کوئی ایسی حکومت جس کے مرکز سے وابستہ لوگ دل برداشتہ اور متنفر ہوں، کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت کے معاملہ میں کوئی واضح وصیت نہیں فرمائی۔ کیونکہ آپ کو یہ بخوبی علم تھا کہ خلافت خود بخود اپنا دامن اس شخص کو پکڑا دے گی جو اس کا اہل ہو گا۔

قریش کا بالصراحت ذکر کرنے اور آگے مزید کچھ نہ فرمانے کا مقصد یہ تھا کہ قریش لازماً اس انتخاب پر متفق ہو جائیں گے جس پر بعد میں ہوئے اختلاف پیدا ہونے کا امکان اگر تھا تو اہل مدینہ یعنی انصار کی جانب سے۔ اس بناء پر قریش کی تخصیص ضروری تھی تاکہ متوقع اختلاف نہ رونما ہو سکے۔ اس تخصیص کے ساتھ ہی آپ نے انصار کا عزت و احترام بھی لازم قرار دے دیا۔ اس کا واضح مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ خلافت مہاجرین کے ہاتھ میں جائے گی۔ اس لئے ان کو مذکورہ وصیت کر دینا ضروری تھا تاکہ وہ حکومت ہاتھ آ جانے پر اپنے انصار بھائیوں کو بھول نہ بیٹھیں۔ ورنہ اس مخصوص وصیت کے کوئی معنی ہی نہیں رہ جاتے۔

ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ خلافت کا معاملہ جس طرح انجام پذیر ہوا، آنحضورؐ کو اس کا بخوبی علم تھا۔ اس لئے کہ ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آپ آئندہ پیدا ہونے والے فتنوں کو محسوس کرتے ہوئے بھی اس مسئلہ کو نظر انداز کر جاتے اور

ان کا سدباب کرنے کے لئے قطعی فیصلہ نہ فرما جاتے۔ خلافت جب قریش کے اندر محدود کر دی گئی، تو اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ یہ منصب حضرت ابوبکرؓ ہی سنبھالیں گے۔ خلافت قریش کے اندر آجانے کے بعد کسی اور کی طرف منتقل نہیں ہو سکتی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ کے بعد جن لوگوں نے اس منصب کو سنبھالا، وہ حضرت عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ اور معاویہؓ ہیں۔ ان میں سے کون ایسا تھا جو حضرت صدیقؓ سے زیادہ نمایاں شخصیت کا مالک اور عام مسلمانوں میں ان سے زیادہ مقبول وہردلعزیز رہا ہو؟

کیا حضرت عمرؓ کو یہ مقام و مرتبہ حاصل تھا؟

جو حضرت صدیقؓ سے تقریباً دس سال چھوٹے تھے۔ جو اسلام کی قبولیت اور آنحضورؐ کی محبت کے شرف میں حضرت صدیقؓ کے ہم پلہ نہ تھے جو مسلم عوام میں حضرت ابوبکرؓ جتنے مقبول وہردلعزیز نہ تھے۔ جن کے قبیلہ کو بھی وہ اثر و رسوخ حاصل نہ تھا، جو حضرت صدیقؓ کے قبیلہ کو حاصل تھا۔

[حضرت عمرؓ کا خلافت کی ہوس میں حضرت ابوبکرؓ کے خلاف آواز اٹھانا بھی خارج از بحث ہے۔ اس لئے کہ یہ خود پہلے شخص تھے جنہوں نے بڑھ کر حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور لوگوں کو بھی اس کے لئے آمادہ کیا۔ حضرت عمرؓ ہی تھے جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا تھا کہ "آپ مجھ سے افضل ہیں"

جن کے جواب میں حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا تھا کہ "آپ مجھ سے توانا ہیں" اور پھر حضرت عمرؓ ہی تھے جنہوں نے کہا تھا کہ "میری توانائی آپ کے فضل کے ساتھ ہے"

یہ تھا وہ حکیمانہ طریق کار جس کی بنیاد پر خلافت کا انتخاب عمل میں آیا۔ یہاں نہ فضیلت نظر انداز کی گئی نہ قوت و توانائی کا حق مارا گیا۔ فضیلت کو اپنا حق مل گیا جو اس موقع پر ضائع ہو جانے کے بعد دوبارہ نہیں مل سکتا تھا قوت و توانائی کو اپنا حق حاصل کرنے کے لئے ابھی مزید وقت موجود تھا۔

کیا حضرت عثمانؓ کو یہ مقام و مرتبہ حاصل تھا؟

جب کہ حضرت عثمانؓ کو اسلام کی نعمت بھی خود حضرت صدیقؓ ہی کے توسط سے ملی تھی۔ یہ درست ہے کہ وہ بنو امیہ سے تعلق رکھتے تھے اور اموی عصبیت اس وقت بڑی طاقتور تھی۔ لیکن اس عصبیت کی باگ ڈور حضرت عثمانؓ کے ہاتھ میں نہیں بلکہ ابوسفیان کے ہاتھ میں تھی۔ پھر اگر اس عصبیت سے فائدہ اٹھانے کے امکانات بھی حضرت عثمان کے لئے ہوتے، جب بھی ان کی پاکبازی سے یہ توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی کہ وہ عصبیت کا سہارا لے کر حضرت ابو بکرؓ کا مقابلہ کرتے اور ان کا وہ حق چھین لینے کی کوشش کرتے جو خود اُن کی رائے کے مطابق بھی حضرت ابو بکرؓ کو ملنا چاہیئے تھا۔

کیا حضرت علیؓ اس مقام و مرتبہ کے زیادہ اہل تھے؟

حضرت علیؓ کو خلافت ہاشمیت ہی کی بنیاد پر مل سکتی تھی۔ اور یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ نسبت کی جڑ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اکھاڑ پھینکی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ بنی ہاشم اپنے تینوں رہنماؤں (حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ اور حضرت عقیلؓ) میں سے کسی ایک پر متفق نہیں ہو سکتے تھے حضرت علیؓ کے اندر اس وقت ایک اور کمی بھی تھی۔ وہ یہ کہ ان کی عمر تیس سال سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ ظاہر ہے کہ جو قوم سن و سال کی وجاہت کو عرصہ سے سیادت و رہنمائی کے لئے بنیادی اہمیت دیتی رہی ہو اسکے مطمح نظر کو آنحضورؐ کی کسی وصیّت کے بغیر بدل دینا آسان نہ تھا۔ اور ثابت شدہ امر ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی بھی متفق علیہ اور مستند وصیت آنحضور علیہ السلام سے منقول نہیں۔

تو کیا معاویہؓ اس مقام و مرتبہ کے مالک تھے؟

ہماری رائے یہ ہے کہ اس وقت معاویہؓ کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آئی ہوگی کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے حقدار بن سکتے ہیں۔ اگر اس وقت ان کی عمر بھی زیادہ ہوتی اور ایسے وافر ذرائع بھی ان کو میسّر ہوتے جو اس سلسلہ میں ان کے مددگار ثابت ہوتے، جب بھی ان کے انتخاب کا دور دور تک امکان نہ تھا۔ اس لئے کہ قریش بنو امیہ کی سیادت پر کسی حال پر رضامند نہیں ہو سکتے تھے۔ قریش اپنے اندر کسی معمولی سے معمولی قبیلہ کو ترجیح دے دیتے مگر بنو امیہ کے حق میں اپنی رائے نہیں استعمال کر سکتے تھے۔ اس لئے کہ خلافت کے بنو امیہ میں جانے کا دوسرا

مطلب یہ تھا کہ اموی حکومت قائم ہو جائے جو اپنی طاقتور عصبیت اور حکومت کا سہارا لے کر تمام قبائل عرب پر ہمیشہ کے لئے مسلط ہو جاتے۔

اس کے برعکس حضرت ابو بکرؓ کے قبیلہ بنو تیم میں خلافت جانے سے اس قسم کا اندیشہ نہ تھا۔ اتنے کمزور اور چھوٹے قبیلہ کے اندر اقتدار کا مستقل طور پر ٹھہر نا محال تھا یہی بات حضرت عمرؓ کے قبیلہ بنو عدی کے متعلق اور خود بنو ہاشم کے متعلق بھی، اور بنو امیہ کے علاوہ قریش کے ہر چھوٹے بڑے قبیلہ کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔

پس جب حضرت ابو بکرؓ کا انتخاب قریش کا متفق علیہ فیصلہ تھا اور نبی علیہ السلام کے ارشادات و اعمال بھی اس انتخاب کی طرف رہبری کر گئے تھے، تو کیا ضرورت آن پڑی تھی کہ بلا وجہ حضرت عائشہؓ اور ان کے والد کے درمیان یا حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ اور ابو عبیدہ کے درمیان کوئی خفیہ سکیم زیر غور آتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ سازش کا یہ شاخسانہ پھوٹا کہاں سے؟ حالانکہ اس کے لئے نہ کوئی وجہ جواز موجود ہے اور نہ سند و دلیل۔

سازش کے مزعوم اور بے بنیاد ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ نہ عملاً واقع ہوئی، نہ اُس کے واقع ہونے کا امکان تھا اور نہ ہی ضرورت تھی۔

رسول اللہؐ کی نگاہ دور بین ان گہرے حقائق سے واقف تھی جو عام ذہنوں کی دسترس سے باہر تھے۔ اس بناء پر آپ ضروری اشارہ فرما کر خاموش ہو گئے آپ

کو بخوبی علم تھا کہ اتنا اشارہ کافی ہے مزید صراحت کی ضرورت نہیں۔ ہم پورے یقین کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ آنحضور علیہ السلام اپنے مرض سے پہلے اور دورانِ مرض دونوں حالتوں میں مسئلہ خلافت کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف تھے اور آپ کو یہ یقین کامل حاصل تھا کہ آپ نے جو اندازہ لگایا ہے، وہ بالکل صحیح اور درست ہے۔ اگر آنحضورؐ صراحت کی ضرورت محسوس کرتے تو ضرور کوئی صریح حکم فرما جاتے۔ ہم یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ آپ مسلمانوں اور اسلام کو فتنہ وشورش کے طوفان میں جان بوجھ کر چھوڑ گئے۔ اور اس کے ازالہ کی امکانی حد تک کوشش نہیں فرمائی۔ آپ نے جو کچھ کیا، اسی پر اکتفا کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپؐ پیش آمدہ صورت حال سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ اس لئے آپ نے مزید تدبیر اور پیش بندی غیر ضروری خیال فرمائی۔

خلافت کا مسئلہ جس قدر اہم تھا، بلا شک وشبہ آنحضورؐ کی نگاہ میں بھی وہ اتنا ہی اہم تھا۔ منصب کی اہمیت کے اسی احساس کے پیش نظر آنحضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کی تربیت پر بھی پوری توجہ مبذول فرمائی تھی۔ مگر آپ یہ نہیں چاہتے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب میں جبر و اکراہ کا کوئی دخل ہو۔ آپ کا منشا یہ تھا کہ لوگ آزادانہ طور پر برضا و رغبت ان کو اس منصب کے لئے منتخب کریں۔

آنحضورؐ خوب جانتے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ ہی اس منصب کے مستحق ہیں اور مسلمانوں کا مفاد بھی انہیں کے انتخاب میں ہے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، وہ محتاج تشریح نہیں۔

رہی یہ دوسری بات کہ حضرت ابو بکرؓ کی جانشینی میں مسلمانوں کا مفاد تھا، تو اس کا سمجھنا بھی کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ اس وقت تک مسلم حکومت وسیع نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے مسلمانوں کو اس امر کی شدید ضرورت تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو دور خلافت آئے، وہ آپ ہی کے مبارک عہد کی ارتقائی کڑی ہو تا کہ مسلمانوں کے اندر نبی علیہ السلام ہی کے دور جیسا پائیدار اتحاد و اتفاق اور یک جہتی باقی رہے۔

ظاہر ہے کہ آنحضورؐ کے اتباع کامل میں دوسرے صحابہ کبار کے مقابلہ میں حضرت ابو بکرؓ کا مقام و مرتبہ بلند تھا۔ اُن کے اندر نبیؐ کی حرف بحرف اتباع اور قدم بقدم پیروی کا جو بے پناہ جذبہ موجود تھا، وہ یہ پیشین گوئی کر رہا تھا کہ اُن کا عہد خلافت عہد نبویؐ ہی کی ارتقائی کڑی ہو گا۔ تاوقتیکہ حالات بدل کر تبدیلی کا مطالبہ نہ کرنے لگیں۔ لوگوں کو حضرت ابو بکرؓ کی ذات سے جو والہانہ لگاؤ اور وابستگی تھی وہ بتا رہی تھی کہ وہ اپنی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کے زور پر کامل اطاعت کروا سکتے ہیں۔ اور اپنی نرم مزاجی اور مشفقانہ برتاؤ کے ذریعہ لوگوں کے باہمی اختلافات اور جھگڑوں کو بھی طے کرا سکتے ہیں۔ اگر کبھی کسی معاملہ کی نزاکت سختی کی مقتضی ہوئی تو اس معاملہ میں بھی وہ ناکام نہیں ہوں گے۔ دین پر جان و دل سے فدا ہونے والے اعوان و انصار بھی ان کی ہر طرح تائید و حمایت کریں گے اور

وہ اہل الرائے بھی ان کا ہاتھ بٹانے سے گریز نہیں کریں گے جو معاملات کے نشیب و فراز پر گہری بصیرت رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت ان کی قوت و طاقت بنے ساتھ ہو گی اور اُن کی قوت و طاقت حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت کے لئے دست و بازو ثابت ہو گی۔

مشیئت نے خلافت کے معاملے کی انجام پذیری کے لئے جو وقت مقرر کیا تھا وہ آ گیا۔ لوگوں کی مشیئت بھی اس سے ہم آہنگ ہو گئی۔ اور جو کام ہونا تھا وہ سب کا سب ایک دن میں ہو گیا

ابتداً ایسا معلوم ہوا کہ خطرہ بہت عظیم ہے جس کی زد سے کوئی چیز محفوظ نہیں۔ انصار ایک جگہ جمع ہوئے اور اس موضوع پر گفتگو ہونے لگی کہ خلافت مہاجرین کو نہیں بلکہ ان کو ملنی چاہیئے۔ قریب تھا کہ فتنہ بے لگام ہو کر اپنے نامعلوم انجام کی طرف چل پڑے اور کسی کے بس میں نہ رہے۔ لیکن قدرت کی کرشمہ کاری کہیئے کہ جس سقیفہ کے اندر اس نے اپنی گردن اٹھائی تھی، ابھی اس کی چوکھٹ سے باہر بھی نہ ہونے پایا تھا کہ لگام کھینچ لی گئی۔

سعد بن عبادہ جو انصار کے رہنما تھے وہ بیمار تھے۔ اس لئے اس موقع کے لئے جس زورِ بیان کی ضرورت تھی وہ اس سے محروم تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ لوگ انہیں کندھوں پر لاد کر سقیفہ کے اندر لائے تھے۔ اور اس وقت ان کی حالت ایسی تھی کہ نہ تو ان کے عزائم اور ارادے ان کی گرفت میں تھے اور نہ ہی

کھل کر گفتگو کر سکتے تھے۔ انہوں نے لوگوں کو خطاب ضرور کیا لیکن حاضرین نے ان کی آواز کو ایک مریض کی آواز کی حیثیت سے سنا جس میں ایک رہنما کی تمکنت، قوت بیان اور زور استدلال مفقود تھا۔ انصار قدیم زمانہ سے دو پارٹیوں (اوس وخزرج) میں منقسم چلے آتے تھے۔ ان دونوں فریقوں کے درمیان جو باہمی آویزش تھی وہ انصار اور مہاجرین کی آویزش سے کہیں زیادہ تھی۔ ادھر حضرت عمرؓ اور ان کے ساتھیوں کی ہوشمندی انصار کی طرف سے اٹھنے والے فتنے کی رفتار سے زیادہ تیز گام اور برق رفتار تھی۔ فتنہ جس وقت جوبن پر آنے کے لئے مچل رہا تھا عین اس وقت حضرت عمرؓ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ موقع پر پہنچ گئے اور اس کا سر کچل کر رکھ دیا۔ ان لوگوں نے اس موقع پر ایسی تقریریں کیں جو تیر و نشتر سے زیادہ کارگر اور مسلح فوجوں سے زیادہ تسخیر کن ثابت ہوئیں۔

حضرت ابو بکرؓ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اس معاملہ (خلافت) کی باگ ڈور اگر قبیلہ اوس کو سونپی گئی تو خزرج والے ان پر حسد کریں گے۔ اور اگر خزرج کے حوالے کی گئی تو اوس والے ان پر حسد کریں گے۔ اہل عرب اس قبیلہ (قریش) کے سوا کسی کی اطاعت کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتے ——— ہم امارت کے مستحق ہیں اور تم وزارت کے اہل ہو۔ تمہارے مشوروں کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ اور تم کو پس پشت ڈال کر معاملات کے فیصلے نہیں کئے جائیں گے۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔

"اہلِ عرب اس قبیلہ کے ہاتھ میں اپنی زمام دیں گے جس کے اندر نبوت اتری اور جو اب تک ان کے معاملات کی دیکھ بھال کرتا رہا ہے۔"

حضرت ابو عبیدہؓ نے فرمایا:۔

"اے انصار! تم نے سب سے پہلے پشت پناہی کی۔ اس لئے تمہیں یہ زیبا نہیں کہ تمہیں سب سے پہلے غیریت اور بیگانگی کا ثبوت دو۔"

ان تمہیدی تقریروں کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے دوبارہ لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"یہ عمرؓ ہیں اور یہ ابو عبیدہؓ۔ تم لوگ ان دونوں میں سے جس کے ہاتھ پر چاہو بیعت کر لو۔"

حضرت عمرؓ اور ابو عبیدہؓ بھی باری باری دوبارہ اٹھے اور فرمایا:۔

"نہیں! خدا کی قسم! ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ کی موجودگی میں زمام کار کا ہمارے ہاتھوں میں آنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ آپ مہاجرین میں سب سے زیادہ افضل ہیں۔ آپ نبیؐ کے یارِ غار ہیں۔ آپ نے نماز میں رسول اللہ کی جانشینی فرمائی اور نماز مسلمانوں کے دین کا افضل ترین جز ہے۔ کون ایسا ہے جس کو آپ پر تقدم حاصل ہو؟ کون ایسا ہے جو آپ کے ہوتے ہوئے یہ منصب سنبھالنے کا مستحق ہو؟ آپ ہاتھ بڑھائیے، ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔"

ان دونوں کے بعد اوس کے ایک رہنما نے بھی بڑھ کر حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور کہا "میں ان لوگوں کا وہ حق کیوں نہ تسلیم کروں، جو ان کو خدا کی جانب سے عطا کیا گیا ہے"۔

(اسید بن حضیر بھی جو اپنے قبیلہ کے نقیب تھے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا اگر خزرج والے ایک مرتبہ اس منصب پر مسلط ہو گئے تو اس سے ہمیشہ کے لئے چمٹ جائیں گے اور تمہیں کوئی موقع نہ دیں گے۔ اس لئے اٹھو اور بیعت کر لو")

حضرت عمرؓ اور ابو عبیدہؓ کے بیعت کر لینے کا مطلب یہ تھا کہ تمام مہاجرین نے بیعت کر لی (اس لئے صورت حال اس قسم کی پیدا ہو گئی کہ خزرج والوں کے لئے بھی بیعت کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔ چنانچہ وہ بھی اٹھے اور بیعت کیلئے ٹوٹ پڑے۔ اس افراتفری میں اژدحام اتنا شدید ہو گیا کہ خود ان کے بیمار رہنما سعد بن عبادہ اپنے ہی آدمیوں کے پیروں تلے آ گئے۔ اس طرح یہ فتنہ جو مدت کی بیماری ساتھ لئے پیدا ہوا تھا، اپنے گہوارہ ہی میں دم توڑ گیا) اس نے صرف تین آدمیوں کو گھور کر دیکھنے کی کوشش کی جنہوں نے اس کے خطرناک تیور بروقت بھانپ لئے اور آگے بڑھ کر گلا گھونٹ دیا۔ یہ تین افراد وہ تھے جو کسی غلبہ و تسلط حاصل کرنے کی غرض سے "فاتحانہ" شان کے ساتھ نہیں بلکہ ناصح مشفق بن کر آئے تھے۔ ان کے اس حکیمانہ اور ہوشمندانہ طرزِ عمل نے لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیا اور انہوں نے ان کی بات کو دشمنوں کی بات سمجھ کر نہیں بلکہ مہمانوں کی گفتگو

سمجھ کر سنا۔ اگر یہ تینوں اشخاص اس نازک موقع پر مغلوب الغضب ہو کر کبر و نخوت کا شکار ہو جاتے یا ان کے اندر یہ احساس پیدا ہو جاتا کہ ہمارے حق کو زبردستی چھینا جا رہا ہے۔ اس لئے رقیبانہ رویہ برتنا چاہیئے تو شاید مسئلہ سلجھنے کی بجائے اور زیادہ الجھ جاتا۔ اگر سعد بن عبادہ اس وقت صحت مند ہوتے، انصار کے درمیان باہمی آویزش بھی نہ ہوتی اور یہ تینوں افراد اس فیصلہ کن موقع پر پہنچنے سے بھی رہ جاتے یا ان حضرات کی جگہ مہاجرین کی ایک جمعیت ہوتی، جو انصار سے دست بگریباں ہو جاتی، تو بہت ممکن تھا کہ معاملات کا دھارا کسی اور ہی رُخ پر بہہ نکلتا جس کے نتیجہ میں آج تاریخ اسلامی کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

ہم ناانصافی کریں گے اگر اس مقام پر متنازعہ فیہ معاملہ کے بحسن و خوبی سے انجام پا جانے میں انصار کی فضیلت نہ تسلیم کریں۔ اگر ان کی کھلی مرضی نہ بھی مانی جائے، تو کم از کم یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ ان کے تحت الشعور میں رضامندی کے جذبات ضرور موجود تھے۔

ہمارے خیال میں انصار کا سعد بن عبادہ کو آگے لانا وقتی طور پر حق قرابت ادا کرنے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ورنہ وہ خلافت حاصل کرنے کے معاملہ میں کوئی سنجیدہ عزم و فکر نہیں رکھتے تھے۔ یہ لوگ سب سے پہلے مسلمان تھے طلب حکومت کا جذبہ بعد کی چیز تھا۔ ان لوگوں کے دل و دماغ انہیں جذبات

واحساسات سے معمور تھے جو دوسرے عام مسلمانوں میں پائے جاتے تھے۔ چنانچہ انہیں لوگوں نے یہ کہا تھا کہ "جب نبی علیہ السلام نے حضرت ابو بکرؓ کو امامت نماز سے سرفراز فرمایا اور دین کے معاملہ میں ان کو اپنا امین سمجھا تو ہم اُن کو دنیا کے معاملہ میں کیوں نہ اپنا امین سمجھیں۔"

یہ لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ قرآن کریم نے مہاجرین کو ان پر مقدم رکھا ہے والسابقون الاولون من المھاجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان۔ اس لئے وہ اپنے استحقاق خلافت پر اتنا قوی ایمان نہیں رکھتے تھے کہ اس کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد برافروختہ ہو جاتے اور اس کے حصول کے لئے جان کی بازی لگا دیتے۔ ان کی نظر میں دین اور مسلمانوں کے مفاد کا تحفظ مقدم اور اقتدار کا حصول ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ اقتدار کی خواہش نے انہیں ایسا اندھا نہیں کر دیا تھا کہ اگر قریش ان کے مدمقابل آ جائیں، تو یہ ضد اور عناد سے مغلوب ہو کر فکر و ذہن کو بالائے طاق رکھ دیں۔ چنانچہ ابھی سقیفہ میں مہاجرین کی طرف سے دلائل کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے اپنے مافی الضمیر کا اظہار یوں کیا کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک مہاجروں میں سے۔

یہ دیکھئے کہ بیعت ہو چکنے کے بعد بھی ان میں سے کبھی کسی نے فرمانروائے وقت کے خلاف سرکشی اور بغاوت کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ جو شخص اقتدار کے خواہاں ہوتے ہیں، وہ تو موقع ملنے پر سرکشی سے باز نہیں رہتے۔

اس لیئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ معاملہ کے اس حسن و خوبی کیساتھ انجام پانے میں انصار کی رضامندی اور خواہش کو پورا دخل حاصل تھا۔ خواہش اور رضامندی بعض وقت ایسی ہوتی ہے کہ بظاہر نظر نہیں آتی مگر غیر شعوری طور پر موجود ہوتی ہے۔

انصار کے اس معاملہ کی نوعیت اس مطالبے کی سی تھی جو ایک بھائی اپنا جائز حق سمجھ کر دوسرے بھائی سے کرتا ہے۔ ان کے مطالبے کی نوعیت دشمنوں کے مطالبے سے مختلف تھی جن کی نظر میں دشمن کے ہاتھ کی ہر چیز چھین لینے کے قابل ہوتی ہے خواہ اس کے لئے صحیح راستہ اختیار کرنا پڑے یا غلط۔

اگر ان لوگوں کا مطالبہ برادرانہ نہ ہوتا، اور یہ ہر قیمت پر اقتدار ہی کے طالب ہوتے۔ اور اگر ان کی نگاہ میں حقوق اور شرعی حدود قابل احترام نہ ہوتیں تو اس نزاع اور کشمکش میں حضرت ابو بکرؓ اور ان کے دونوں ساتھیوں کی ہر تدبیر رائیگاں جاتی اور فتنہ ایسی نازک صورت اختیار کر جاتا کہ اس کی مدافعت کے لئے اگر پہلے سے بھی لمبے چوڑے نقشے تیار کر لیے جاتے جب بھی یقینی طور پر ناکامی ہوتی۔ اور گہرے سے گہرا وعظ و پند بھی بے اثر ثابت ہوتا۔ حضرت ابوبکرؓ اور ان کے ساتھی زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے تھے کہ قریش کی رائے عامہ اپنے حق میں ہموار کر لیں مگر ان کے بس میں یہ نہ تھا کہ جو لوگ تلوار کے علاوہ کسی کی بات ماننے والے نہ ہوں اُن کو رام کر لیں۔ اور جو لوگ موافقت و مصالحت

سے بیزار بیٹھے ہوں اُن کو کلمۂ اتفاق پر اکٹھا کر لیں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت نتیجہ تھی ان مقدمات کا جو واقعات اور شعوری و غیر شعوری محرکات و اسباب کی صورت میں عرصے سے کام کر رہے تھے۔

اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اس انتخاب کے علاوہ کوئی اور انتخاب ممکن نہیں تھا ورنہ بصورتِ دیگر ایسا فتنہ اٹھ کھڑا ہوتا جس کو فرد کرنے میں نہ تو کسی کی پسند و ناپسند کارگر ثابت ہو سکتی تھی اور نہ کوئی رائے اور تدبیر سود مند ہو سکتی تھی۔

ہم یہ باور نہیں کر سکتے کہ کبار صحابہ میں سے کوئی شخص خلافت کے منصب کو حقیر سمجھتا رہا ہوگا کہ اس رتبۂ بلند کے لئے اپنے انتخاب کو ناپسند کرتا ہوگا اور ساتھ ہی یہ خواہش بھی رکھتا ہوگا کہ لوگ اس کے متعلق یہ حسن ظن رکھیں کہ وہ اس بھاری ذمہ داری کو نبھانے کی اہلیت رکھتا ہے۔

نبیؐ کی جانشینی کا منصب ایسا شرف تھا جس کو کوئی بھی ایسا شخص حقیر نہیں سمجھ سکتا تھا جو نبیؐ سے محبت رکھتا ہو اور نبیؐ کے نقشِ قدم پر چلنے کی اپنے اندر تڑپ بھی رکھتا ہو۔ صحابہ کا عالم تو یہ تھا کہ وہ اس عظیم و برتر ذمہ داری سے فروتر درجے کی ذمہ داریوں کی انجام دہی کو بھی اپنے لئے باعثِ شرف و افتخار سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ موقع آنے پر اپنی اس خواہش کو ■ بالکل نہیں

سکتے تھے۔ چنانچہ یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ اہل نجران آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے درخواست کی کہ "آپ ہمارے پاس اپنا کوئی امین آدمی بھیجئے۔" آپ نے فرمایا "میں تمہارے پاس طاقتور امین بھیجوں گا۔"

آنحضورؐ کے اس فرمان کے بعد صحابہ کے دل اس منصب کا شرف حاصل کرنے کے لئے بے چین ہو گئے اور نگاہ شوق سے انتظار کرنے لگے کہ کس کا انتخاب ہوتا ہے۔ آنحضورؐ نے ابو عبیدہ بن جراح کو اس ذمہ داری کے لئے منتخب فرمایا۔

اس واقعہ کو روایت کرتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس نجران کا وفد آیا اور کہا "اے محمدؐ! ہمارے پاس ایسا آدمی بھیجئے جو آپ کا حق ہم سے وصول کرے اور ہمارا حق ہم کو دے۔" آپ نے فرمایا "قسم ہے اس ذات پاک کی! جس نے مجھے حق دے کر بھیجا ہے۔ میں تمہارے پاس طاقتور امین بھیجوں گا۔" حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ "میں نے اس موقع کے سوا کبھی امارت کی خواہش نہیں کی۔ چنانچہ میں نے اپنا سر اونچا کر دیا تاکہ آنحضورؐ مجھ کو دیکھ لیں۔ مگر آنحضورؐ کی نظر انتخاب ابوعبیدہؓ پر پڑی۔"

حضرت ابوبکرؓ کو بیعت کے ابتدائی زمانہ میں یہ دیکھ کر دکھ ہوتا تھا کہ کچھ لوگ ان سے کھنچے کھنچے رہتے ہیں اور برضا و رغبت بیعت نہیں کرتے اس رنجش کا اظہار انہوں نے متعدد موقعوں پر کیا۔ ایک دفعہ فرمایا "اے لوگو!

کیا میں اس منصب کا مستحق نہیں۔ کیا میں نے سب سے پہلے اسلام کو گلے نہیں لگایا؟"

رنجش کا اس انداز میں اظہار بظاہر عقلِ سلیم پر گراں گذرتا ہے اور باوقار آدمی کی شان کے منافی نظر آتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جب ایک مخلص اور باوقار آدمی یہ دیکھتا ہے کہ کچھ لوگ بے وجہ بے رخی برت رہے ہیں حالانکہ وہ اس بے رخی کا مستحق نہیں، تو اس کے جذبات جائز طور پر مجروح ہوتے ہیں۔

اس مقام پر یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ منصب خلافت کو وجہ شرف و افتخار سمجھنا علیحدہ بات ہے اور اس پر قبضہ جمانے کے لئے حیلہ و جعل سازی سے کام لینا دوسری بات ہے۔ یہی دوسری چیز ہے جس کو ہم تسلیم نہیں کرتے، کیونکہ ہمیں اس کے حق میں ایک دلیل بھی نہیں ملتی۔ اس کے برعکس اس کے مخالف پہلو پر دلائل کا انبار ملتا ہے۔

خلافت کے منصب پر فائز ہو جانے کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور ان کے ساتھیوں نے خلافت کی جڑوں کو مضبوط کرنے اور اسلام کو تمرد اور سرکشی کی ہلاکت خیزیوں سے بچانے کے لئے جو تدابیر کیں وہ بھی تعریف کی مستحق ہیں انہوں نے اپنی کوشش سے ہر اس شیرازہ کو منتشر کر دیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کی وحدت اور یک جہتی پر آنچ آ سکتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عباسؓ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اگر وہ قبول کریں تو ان کو اتنی جائیداد دے دی جائے

جو ان کی اور ان کی اولاد کی گذر اوقات کے لیے کافی ہو۔ یہ اقدام اس لئے کیا گیا کہ جو لوگ تخریبی اور شرانگیز سرگرمیوں میں مشغول ہیں وہ کسی وقت حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کو ان کی لاعلمی میں اپنی مطلب برآری کے لئے استعمال نہ کر جائیں۔ ایسا ہوا تو بعد میں سینکڑوں خرابیاں اور رخنے پیدا ہو جائیں گے۔ ابوسفیان نے آپنے عزائم کے تحت قریش کے طاقتور قبائل (بنو امیہ اور بنو ہاشم) کا نام لے کر اس قسم کا شوشہ چھوڑنے کی کوشش کی تھی مگر ناکامی ہوئی۔

حضرت ابوبکرؓ اور اُن کے ساتھیوں نے عربی وحدت اور اسلامی شیرازہ بندی کے لئے اسی قسم کی اور بھی بہت سی کوششیں کیں لیکن ان تمام کوششوں میں انہوں نے وہی تدابیر اختیار کیں جن کا اختیار کرنا ضروری تھا اور جن کے ترک کر دینے میں نقصان تھا۔

حضرت ابوبکرؓ خلیفہ اوّل تھے۔

کیونکہ وہ صدیقِ اوّل تھے۔

کیونکہ ان کے اندر خلافت کی وہ تمام شرائط بدرجۂ اتم موجود تھیں جو ان کے معاصرین میں یا تو مفقود تھیں یا اگر پائی جاتی تھیں تو ان کا درجہ اتنا اونچا نہ تھا۔

(پس حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب وہ معیاری انتخاب تھا جس کی نظیر تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس لئے کہ یہ انتخاب کسی تدبیر و تمہید کے بغیر خالص

جمہوری طریقہ پر عمل میں آیا تھا۔ لیکن اگر کسی کو یہ بات تسلیم نہیں اور یہی اصرار ہے کہ یہ انتخاب سوچی سمجھی اسکیم اور تدبیر کے ماتحت عمل میں آیا تھا، تو اس کے جواب میں ہم صرف یہ کہنے پر اکتفا کریں گے کہ ایسی سکیم اور تدبیر بھی قابل صد ستائش ہے جس نے اختلاف و پراگندگی کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا اور جس کے ذریعہ بہترین انتخاب پایۂ تکمیل کو پہنچا۔)

اوصاف

لوگ شکل وصورت یوں بیان کرتے ہیں کہ رنگت گوری اور زردی مائل تھی۔ گھنے بال . . . رخسار اور چہرہ ہلکا ہلکا، پیشانی ابھری ہوئی، آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئیں۔ جسم اتنا نحیف ولاغر کہ آزار بند مشکل سے کمر پر رکتا تھا۔ پنڈلیاں اور رانیں دبلی پتلی، چھریرا بدن۔ قد کے متعلق کہتے ہیں کہ منحنی تھا لیکن بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ جھکا ہوا نہیں بلکہ تیر کی طرح سیدھا تھا۔ شاید یہ زمانہ شباب کی بات ہو گی۔

قد کے لمبے یا پست ہونے کے متعلق کوئی واضح بیان نہیں ملتا لیکن بعض واقعات سے، خاص طور پر ہجرت کے واقعہ سے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قد ذرا پست ہو گا۔

ہجرت کے واقعہ میں آتا ہے کہ نبی علیہ السلام ایک اونٹ پر حضرت ابوبکرؓ دوسرے پر اور حضرت عامر ابن فہیرہ تیسرے پر سوار تھے۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کا اونٹ جب بوجھ سے تھک جاتا، تو آپ حضرت ابوبکرؓ کے اونٹ پر سوار ہو جاتے۔ حضرت ابوبکرؓ حضرت عامر کے اونٹ پر اور عامر آنحضورؐ کے اونٹ پر۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ عامر بن فہیرہ سے ہلکے رہے ہوں گے اور عامر بن فہیرہ کا وزن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کم رہا ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تاریخ میں آتا ہے کہ آپ میانہ قد تھے، نہ زیادہ پستہ قد نہ زیادہ لمبے۔ جسم مبارک بھی ایسا زیادہ بھرا ہوا نہیں تھا۔ بلکہ موٹاپے اور دبلے پن کے بین بین تھا۔ اگر ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قامت میانہ قدی سے نکلتا ہوا ہوتا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا عامر بن فہیرہ سے اتنے ہلکے نہ ہوتے کہ اس ہلکے پن کا اثر اونٹ کی سواری پر پڑتا۔

حضرت ابوبکرؓ کے راویوں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ جاہلیت اور اسلام دونوں زمانوں میں ایک خاص کردار کے مالک تھے۔ لوگوں کے ساتھ شفقت و رحمت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ آپ کے اندر وہ تمام اوصاف رسے بسے ہوئے تھے جو دلوں کو موہ لیتے ہیں۔ خاص طور پر تواضع اور انکساری تو آپ کے مزاج کا لازمہ بن چکی تھی۔ چنانچہ آپ نے جاہلیت اور اسلام کسی بھی زمانہ میں کسی شخص سے تعلّی کا اظہار نہیں کیا۔ خلافت کے زمانہ میں تواضع پہلے سے بھی زیادہ پیدا ہو گئی تھی۔ جب کوئی شخص آپ

کی تعریف کرتا تو فرماتے، خداوند کریم! تو میرے حال سے بہتر واقف ہے۔ اگر اونٹنی پر سوار ہوتے اور مہار نیچے گر جاتی تو خود اتر کر اٹھا لیتے اور کسی سے مہار پکڑانے کو نہ کہتے۔ کبر و غرور سے اس درجہ نفرت تھی کہ اس خطا پر پردہ نشینوں کو بھی معاف نہیں کرتے تھے۔ ایک روز آپ حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس گئے۔ وہ اپنے کپڑے کے دامن کی طرف نگاہ کئے کچھ اس انداز سے چل رہی تھیں جس سے کچھ کبر و نخوت کی بو آتی تھی۔ حضرت ابو بکرؓ کی نظر پڑی تو فرمایا بیٹی عائشہ! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ خدا اس وقت تمہاری طرف سے نظریں پھیرے ہوئے ہے؟

حضرت عائشہؓ نے پوچھا "کیوں وجہ کیا ہے؟" آپ نے فرمایا "کیا تمہیں علم نہیں کہ بندہ جب زینت دنیا کی وجہ سے غرور کا شکار ہو جائے تو اس وقت اس کا رب اس سے نفرت کرنے لگتا ہے اور یہ نفرت اس وقت تک برابر باقی رہتی ہے جب تک وہ شخص آرائش ترک نہ کر دے۔" حضرت عائشہؓ نے وہ لباس صدقہ کر دیا اور حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا، "امید ہے کہ خداوند تعالٰے معاف کر دے گا۔"

حضرت ابو بکرؓ کا حسن سلوک محض زبان کی حد تک محدود نہ تھا جس کو نبا لے جانا آسان ہوتا ہے بلکہ عملی دنیا میں بھی محسوس کیا جاتا تھا اور دست گیری اور جود و کرم جیسے اوصاف کی صورت میں جلوہ گر تھا۔ آپ نے جب اپنے شہر

سے ہجرت کا ارادہ کیا تو ابن الدغنہ نے قریش کو مخاطب کرتے ہوئے آپ کے اوصاف ان الفاظ میں بیان کئے "کیا تم ایسے شخص کو نکال دو گے جو غریبوں کی مدد کرتا ہے، جو رشتے قائم رکھتا ہے، جو دوسروں کے بار اپنے سر اٹھاتا ہے، جو مہمانوں کی خاطر و مدارات کرتا ہے اور لوگوں کا مصیبتوں میں ساتھ دیتا ہے۔"

غرض یہ کہ آپ وسیع الظرف اور غم خوار و ہمدرد تھے۔ جود و کرم کی راہ میں مال وجاہ لٹا دینا معمول بن چکا تھا۔ غم خواری و ہمدردی اور محبت و شفقت کے ساتھ آپ کے اندر تند مزاجی بھی تھی۔ مگر ایسی سرکشی نہ تھی کہ بے مہار ہو کر جدھر چاہے چل پڑے اور قابو ہی میں نہ آ سکے۔ اس تند مزاجی کا ذکر آپ سے قریب رہنے والوں نے بھی کیا ہے اور خود آپ نے بھی بیعت سے بعد والے خطبے کی ابتدا میں آپ نے خود فرمایا "یاد رکھو! میرے اندر بھی ایک شیطان ہے۔ پس جب تم مجھ کو غصہ کی حالت میں دیکھو تو مجھ سے درگذر کر جاؤ۔"

حضرت عمر فرماتے ہیں "مجھے ان کے غصہ کا بعض دفعہ لحاظ کرنا پڑتا تھا"۔ یہی وجہ ہے کہ جب سقیفہ بنی ساعدہ میں جانا پڑا تو حضرت عمر راستے بھر گفتگو کی تیاری کرتے گئے۔ صرف اس اندیشہ سے کہ کہیں حضرت ابوبکرؓ اس مقام پر غصہ سے مغلوب نہ ہو جائیں۔

(حضرت ابن عباسؓ سے حضرت ابو بکرؓ کے متعلق پوچھا گیا، تو انہوں نے فرمایا "وہ اپنے غصہ اور تند مزاجی کے باوجود سراپا خیر تھے")

آپ کے مزاج کی حدت و تیزی جو شتر بے مہار کی طرح آزاد نہیں تھی اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ آپ کے اندر تاثر کا مادہ بہت تھا۔ کیسی ہی صورت کیوں نہ ہو، محبت و شفقت سے دل لبریز رہتا تھا۔ غم و حزن کو طبیعت بہت جلد قبول کرتی تھی۔ مصیبت زدوں، غم زدوں کی بہت دلدہی اور غمگساری فرمایا کرتے تھے (حضرت عائشہؓ کے بقول "آپ کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب تھا اور سینے میں سوزش و تپش کی فراوانی تھی)

"وہ رقیق القلب آدمی ہیں۔ اگر آپ کی جگہ نماز کے لئے کھڑے ہوں گے

——— حضرت عائشہؓ آنحضورؐ سے مخاطب ہیں ———

تو لوگ اُن کی آواز نہ سن سکیں گے"

آپ جاہلیت اور اسلام دونوں ادوار میں باوقار اور وضعدار رہے۔ وضعداری کو چھوڑنا اپنی عزت و حمیت کے منافی سمجھتے اور شک و شبہ سے ہمیشہ پرہیز کرتے تھے۔ چنانچہ شراب کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا، اس لئے کہ وہ وقار کو مجروح کرتی تھی۔ آپ سے پوچھا گیا کہ آپ جاہلیت کے زمانہ میں شراب سے کیوں پرہیز کرتے رہے؟ فرمایا "اس لئے کہ مجھے اپنی عزت و ناموس زیادہ عزیز تھی۔ اور میں اپنی وضع داری کو کھونا پسند نہیں کرتا تھا۔ جو شخص شراب

نوشی کرتا ہے، وہ اپنی عقل و وضعداری دونوں ضائع کرتا ہے۔")

وضعداری ہی کا ثمرہ یہ تھا کہ آپ شک وشبہ کے مقامات سے دامن بچا کر چلتے تھے۔ جاہلیت کے زمانہ میں ایک آدمی نے آپ سے درخواست کی کہ آپ اس کے ساتھ چل کر اس کا کوئی کام کرا دیں۔ آپ نے اس آدمی کو ایسے راستے سے گذرتے دیکھا جو عام راستے سے مختلف تھا، تو اس سے دریافت کیا کہ "ادھر کہاں جا رہے ہو؟ اصل راستہ تو یہ ہے۔"

اُس آدمی نے کہا "اُس راستہ میں کچھ ایسے لوگ ہیں جن کے پاس سے ہو کر گذرنے میں میں شرم محسوس کرتا ہوں۔"

آپ نے فرمایا، "اچھا تو تم مجھے ایسے راستہ پر ڈالنا چاہتے ہو، جہاں شرم تمہیں نہیں آتی۔ پھر تو میں تمہارے ساتھ جانے سے رہا۔"

وضعداری ہی کی وجہ سے رکیک گفتگو سے ہمیشہ مجتنب رہے۔ جب تک گفتگو کی ضرورت پیش نہ آتی، زبان نہ کھولتے اور جب بولتے تو خوب بولتے اور بولنے کا حق ادا کر دیتے۔ آپ نے اپنے کسی عامل کو وصیت فرمائی ہے۔ "جب تم لوگوں کو نصیحت کرو تو بہت مختصر کرو۔ لمبی گفتگو دماغ میں سلسلہ کے ساتھ محفوظ نہیں رہتی۔"

اسلام اور جاہلیت دونوں زمانوں میں صداقت آپ کا شعار رہا۔ اسی وجہ سے آپ قریش کے سب سے زیادہ مقبول ضامن تھے۔ جب بھی کوئی شخص

کرتے تو ضرور ایفاء کرتے۔ خواہ قرضدار سے معاملہ درپیش ہو یا قرض خواہ سے سچائی کا اصول ہر ایک کے ساتھ برتتے۔ خون بہا (دیت) اور اجتماعی جرمانوں جیسے اہم معاملات میں بھی آپ کی ذات پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ جب اس قسم کے کسی معاملہ کی ضمانت دے دیتے تو لوگ پورے اعتماد و اطمینان کے ساتھ قبول کر لیتے۔ آپ کے علاوہ اگر کوئی دوسرا شخص اس قسم کی کوئی ذمہ داری اپنے سر لیتا تو لوگ بالعموم اس کا ساتھ نہ دیتے اور اس کی ضمانت رد کر دیتے۔

آپ کی صداقت شعاری بڑی آزمائشوں سے گذری ہے۔ لیکن ہر آزمائش کی بھٹی سے کھری اور چمکدار نکلی۔ خولہ بنت حکیم نے آنحضورؐ سے حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت عائشہؓ کا ذکر کیا۔ آنحضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو پیغام بھیج دیا۔ ادھر حالت یہ تھی کہ حضرت عائشہؓ کی نسبت پہلے ہی سے مطعم بن عدی کے لڑکے کے ساتھ قرار پا چکی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی زوجہ ام رومان سے فرمایا، "مطعم بن عدی کے لڑکے سے عائشہ کی نسبت ٹھہر چکی ہے۔ واللہ! ابوبکر نے کبھی وعدہ خلافی نہیں کی۔"

پھر مطعم کے پاس گئے۔ اس وقت اُس کی بیوی اُس کے پاس موجود تھی آپ نے اُس سے پوچھا "لڑکی کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"
مطعم نے اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا "کہو تم کیا کہتی ہو؟" وہ

P.P.

حضرت ابوبکرؓ سے مخاطب ہو کر بولی" اگر ہم اپنے لڑکے کو تمہارے ہاں بیاہ دیں، تو تم اس کو دین سے برگشتہ کر کے اپنے دین میں داخل کر لو گے۔"

آپ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور مطعم سے پوچھا" بتاؤ کیا کہتے ہو؟"

اس نے جواب دیا" وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، تم سن رہے ہو۔"

اس وقت حضرت ابوبکرؓ کو یہ اطمینان ہوا کہ وہ اب اپنے وعدہ سے عہدہ برآ ہو چکے۔ اس سے پہلے تک وہ اس وعدہ کو گلے کا ہار سمجھتے تھے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ کرنے میں جو شرف تھا، وہ مخفی نہیں اور اُن کے دل میں آنحضورؐ کے لئے جو عزت و احترام تھا، وہ بھی محتاج تشریح نہیں۔

حضرت ابوبکرؓ جیسے صداقت شعار اور وعدے کے پکے تھے، ویسے ہی بہادر بھی تھے۔ رزم اور بزم دونوں میں ایک ہی عالم تھا۔ آپ نے جب اسلام قبول کر لیا، تو پھر بے خوف و خطر اسلام کا اعلان کرنے لگے اور کھلے بندوں نماز اور دعا کے فرائض انجام دینے لگے۔ حالانکہ اس سلسلہ میں جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا، وہ ناقابل بیان ہیں۔

جب بھی جنگ چھڑی تو نازک سے نازک گھڑی میں آپ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوش بدوش رہے۔ بعض پرخطر معرکوں میں بہت سے جانباز پیٹھ دکھا گئے لیکن کسی ایسی پرخطر گھڑی کا تذکرہ ہمیں نہیں ملتا جس میں حضرت

ابوبکرؓ نے ہزیمت و شکست کھائی ہو۔ جن موقعوں پر ثابت قدمی اور استقلال
کا دامن تھامے رکھنا دشوار ہوتا ہے، ان موقعوں پر بھی حضرت ابوبکرؓ ان
ہی لوگوں میں نظر آتے جنہوں نے آخری دم تک پامردی کا ثبوت دیا۔
جنگ احد اور حنین سے بڑھ کر نازک وقت مسلمانوں پر کسی اور جنگ
میں نہیں آیا۔ ان دونوں جنگوں میں بہت سے لوگ بھاگ کھڑے ہوئے، بہت
سے شہید ہو گئے۔ اور جنگ احد میں تو دونوں فوجوں میں یہ افواہ بھی پھیل گئی
تھی کہ آنحضورؐ نے جامِ شہادت نوش فرما لیا۔ اس خبر نے کمزوروں کے دل
بٹھا دیئے۔ اور بہادروں نے کہا، "آنحضورؐ کے بعد تم لوگ زندگی لے کر کیا کرو
گے؟ آگے بڑھو اور رسول اللہ کے نقش قدم پر مر مٹو!"
(جنگ احد (دونوں جنگوں میں شدید تر) میں حضرت ابوبکرؓ ان لوگوں
میں پیش پیش تھے جو آخر وقت تک صبر و استقلال کے ساتھ میدان میں ڈٹے
رہے۔ انہوں نے دیکھا کہ زرہ کا حلقہ پیارے دوست اور محبوب نبیؐ کی
جبین مبارک میں چبھ گیا ہے تو بے چین ہو گئے اور مضطرب ہو کر اس کو کھینچ
لینے کے لئے جھک پڑے۔ مگر حضرت ابو عبیدہؓ نے قسم دلائی کہ وہ خود حلقہ
زرہ کو نکالنے کا شرف حاصل کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے دانتوں کے
ذریعہ آہستہ سے حلقہ زرہ نکال لیا۔ آنحضورؐ کے دو دانت حلقوں کے ساتھ
باہر نکل پڑے[1]

ان اخلاقی خوبیوں کے ساتھ ساتھ آپ میں ذہنی اور عقلی اوصاف بھی اتنے زیادہ تھے کہ آپ اپنے ہمعصروں میں ممتاز نظر آتے تھے۔ آپ کے متعلق اور آپ کے دوست ابو عبیدہؓ کے متعلق لوگ کہا کرتے تھے کہ "یہ دونوں قریش کے مدبر ہیں"۔ روایات میں آپ کے متعلق آتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو باتیں تلمیحات و اشارات میں وحی کی جاتیں، آپ اُن کے اسرار و رموز سمجھنے میں سب سے سبقت لے جاتے تھے۔

(آپ کے علم اور ذہانت کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا، "مجھے دودھ کا بھرا ہوا ایک پیالہ عنایت کیا گیا۔ میں نے اتنا دودھ پی لیا کہ اچھی طرح سیر ہو گیا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ اس کے اثرات میرے گوشت و پوست میں بڑی تیزی سے دوڑ رہے ہیں۔ اس پیالہ سے کچھ دودھ بچ رہا تھا۔ میں نے بچا ہوا دودھ ابو بکر کو دے دیا"۔

لوگوں نے عرض کیا، "یارسول اللہ! کیا اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کو علم بخشا اور آپ نے اس سے خوب دامن بھرا اور اس میں سے کچھ بچا کر ابو بکرؓ کو بھی عنایت فرما دیا"۔

آنحضورؐ نے فرمایا، "تم اصل حقیقت کو پہنچ گئے"۔

حضرت ابو بکرؓ کو مذکورہ بالا ذہنی صلاحیت کے علاوہ روحانی طاقت بھی عطا ہوئی تھی۔ اس طاقت سے مراد وہ طاقت ہے جس کو آج ہم ضمیر کی

بیداری سے تعبیر کرتے ہیں ۔ضمیر کی بیداری کا انحصار اس بات پر ہے کہ انسان دوسروں کے حقوق کو نگاہ کے سامنے رکھے، حسن سلوک برتے اور بدسلوکی سے اجتناب کرے ۔ یہ وصف حضرت ابوبکرؓ کے یہاں جاہلیت کے زمانے میں بھی نظر آتا ہے ۔جب کہ انہوں نے اُس دین کو اختیار نہیں کیا تھا جو نیکی کا حکم دیتا اور برائی سے روکتا ہے ۔ اور اتباع حق اور اجتناب باطل کی دعوت دیتا ہے ۔جب یہ دین آیا تو اُس نے اسی قدیم بنیاد پر اپنا قصر مشید تعمیر کیا ۔ اور حضرت ابوبکرؓ کا نفس اس بلند مقام پر پہنچ گیا، جہاں کوئی پاکیزہ نفس دوسروں کے حقوق کی نگہداشت، اعمال صالحہ کی رغبت اور شر و بدی سے مسلسل بیزاری کے بعد پہنچ سکتا ہے ۔

ربیعہ اسلمی بیان کرتے ہیں کہ "میرے اور ابوبکرؓ کے درمیان کچھ ناخوشگوار سی گفتگو ہو گئی ۔ انہوں نے مجھ سے ایسی بات کہی جو مجھے شاق گذری ۔ پھر ان کو ندامت ہوئی ۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا" اے ربیعہ! تم بھی ویسی ہی سخت بات مجھے کہہ لو جو میں نے تمہیں کہی تھی تاکہ بدلہ چک جائے ۔"

میں نے کہا،" میں ایسا نہیں کر سکتا ۔"

انہوں نے فرمایا،" تجھے کہنا پڑے گا ورنہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تمہارے خلاف چارہ جوئی کروں گا ۔"

میں نے کہا،" کچھ بھی ہو، میں ایسا نہیں کرنے کا ۔"

اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ چلے گئے اور قبیلہ اسلم کے کچھ لوگوں نے میرے پاس آکر مجھ سے کہا، "خدا ابوبکرؓ پر رحم کرے۔ کس بات پر وہ تمہارے خلاف چارہ جوئی کریں گے! حالانکہ زیادتی انہی کی تھی۔"

میں نے اُن سے کہا، "کیا تم لوگ جانتے نہیں کہ یہ ابوبکرؓ کون ہستی ہیں؟ یہ نبیؐ کے یارِ غار ہیں اور اسلام کی خدمت کرتے کرتے وہ بوڑھے دکھائی دینے لگے ہیں۔ دیکھو! کہیں مڑ کر دیکھ نہ لیں اور یہ نہ محسوس کرنے لگیں کہ تم لوگ میری حمایت کر رہے ہو۔ اس سے اُن کو تکلیف ہو گی اور جب وہ رسول اللہ کے پاس جائیں گے، تو رسول اللہ بھی خفا ہوں گے۔ ان دونوں کی ناراضگی سے خدا بھی ناراض ہو جائیگا۔ پھر ربیعہ کے لئے کوئی ٹھکانا نہ رہے گا۔"

غرض یہ کہ حضرت ابوبکرؓ چلے گئے اور میں تنہا ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئے اور آپ کے سامنے پورا واقعہ کہہ سنایا۔ آنحضرتؐ نے اپنا سر اٹھایا اور فرمایا، "اے ربیعہ! تمہارے اور صدیق کے درمیان کیا بات ہو گئی؟"

میں نے عرض کیا، "یا رسول اللہ! یہ یہ ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے ایسی بات کہہ دی جو مجھ پر شاق گذری۔ پھر انہوں نے کہا کہ جو بات میں نے تمہیں کہی ہے وہ تم مجھے بھی کہو تاکہ بدلہ چک جائے۔ میں نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔"

آنحضورؐ نے فرمایا "ہاں ٹھیک ہے۔ تمہیں وہ بات ان کو نہیں کہنی چاہئے بلکہ یہ کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کر دے۔"

حضرت ابو بکرؓ کسی کے ساتھ بدسلوکی کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ یہ بھی ناپسند کرتے تھے کہ کوئی شخص ان کے ساتھ بدسلوکی کرے۔ آپ اس راز سے آشنا تھے کہ بدسلوکی اور سخت روی سے نفس انسانی پر کیا گذرتی ہے اور انسان اُس سے متاثر ہو کر کس طرح ایسے موقعوں پر حلم و بردباری اور توازن فکر کھو بیٹھتا ہے۔ حالانکہ ان موقعوں پر اس کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔

ایک واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ اس دوران ایک آدمی نے حضرت ابو بکرؓ کو ایذا پہنچائی۔ وہ خاموش رہے۔ اُس نے دوبارہ وہی حرکت کی۔ وہ پھر بھی خاموش رہے۔ اُس نے تیسری بار پھر وہی حرکت کی۔ اس وقت حضرت ابو بکرؓ سے نہ رہا گیا اور انہوں نے اس سے انتقام لے لیا۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ! کیا آپ مجھ سے ناراض ہو گئے؟"

رسول اللہ نے فرمایا "وہ آدمی جو کچھ کہہ رہا تھا، آسمان سے ایک فرشتہ اتر کر اس کی تکذیب کر رہا تھا۔ لیکن جب تم نے اس سے انتقام لیا تو فرشتہ کی بجائے شیطان اترا۔"

یہ ایک نبویؐ اسلوبِ تعلیم تھا جس کے ذریعہ حضورؐ نے اپنے امین ساتھی کی تند مزاجی اور گرمی کا علاج فرمایا جو ایک عظیم کام کی ذمہ داری کے لیئے تیار کیا جا رہا تھا۔ ایک ایسے کام کے لیئے جس کی ذمہ داری سنبھالنے والے کے لیئے یہ ضروری ہے کہ جو صدمات اس کی طرف سے دوسروں کو پہنچیں ان سے اس کو خود بھی دکھ اور تکلیف ہو تا کہ آئندہ وہ اس کی تلافی کر دے اور جو صدمات اس کو دوسروں کی جانب سے پہنچائے جائیں، اُن کو وہ اہمیت نہ دے۔

حضرت ابوبکرؓ کے ضمیر کی بیداری کی ایک یہ دلیل ہے کہ ایک لقمہ جس پر انہیں شک پڑ گیا تھا آپ سے ہضم نہ ہو سکا۔ آپ کا ایک غلام کچھ کما کر لایا کرتا تھا۔ ایک رات وہ کچھ کھانے کی چیزیں لایا۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان میں سے ایک لقمہ تناول فرما لیا۔ غلام نے عرض کیا "ہر روز تو آپ کھانے کے متعلق مجھ سے پوچھا کرتے تھے، آج آپ نے کیوں نہیں پوچھا؟"

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا! بھوک کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا۔ کہاں سے لائے تھے تم یہ کھانا؟"

غلام نے بتایا "میں اپنی جاہلیت کے دنوں میں ایک قبیلہ کے پاس جایا کرتا تھا۔ آج میرا گذر اسی قبیلہ کے پاس سے ہوا۔ ان کے یہاں کوئی تقریب تھی۔ انہوں نے مجھے یہ کھانا دیا۔"

حضرت صدیقؓ نے فرمایا "تم نے تو مجھے ہلاک ہی کر دیا تھا!" اور پھر انہوں نے اپنا ہاتھ حلق میں ڈال کر قے کرنی چاہی۔ مگر لقمہ تھا کہ نکلنے کو نہ آتا تھا۔ آپ سے عرض کیا گیا کہ یہ پانی کے بغیر نہ نکلے گا۔ آپ نے پانی کا ایک برتن منگایا اور پانی پی کر قے فرمانے لگے۔ یہاں تک کہ لقمہ باہر آگیا۔

آپ سے پوچھا گیا "خدا آپ پر رحمت کرے! اتنا کچھ آپ نے صرف ایک لقمہ کی وجہ سے کیا!"

آپ نے فرمایا "اگر یہ میرے دم واپسیں کے ساتھ ہی نکلتا۔ جب بھی میں اس کو نکال کر رہتا!"

ہمارے خیال میں آپ پر کوئی دن بھی ایسا نہیں گذرا جس میں آپ نے بڑا احسان اور محبت و موّدت کے تقاضوں کو پورا نہ کیا ہو۔ خواہ ان کو پورا کرنے کے لئے زبان کھول کر آپ سے درخواست کی گئی ہو، خواہ محض زبان حال کی پکار ہو۔

رسول اللہؐ کی عادت تھی کہ آپ وقتاً فوقتاً اپنے اصحاب سے ان نیکیوں اور بھلائی کے کاموں کی بابت دریافت فرمایا کرتے تھے جن کے کرنے میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہو۔ صحابہ کوئی چیز آپ سے پوشیدہ نہیں رکھتے تھے۔ آپ کے پوچھنے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ سوال کا جواب دیا جائے اور آپ اس جواب کے مطابق کوئی ہدایت یا وعظ و نصیحت فرمائیں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد دریافت فرمایا، "آج تم میں سے کون روزے سے ہے؟"

حضرت عمرؓ نے عرض کیا، "یا رسول اللہؐ! آج رات روزہ رکھنے کی میری کوئی نیت نہ تھی۔ اس لئے اس وقت روزہ سے نہیں ہوں۔"

حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا، "یا رسول اللہؐ! میں نے رات ہی روزہ رکھنے کا ارادہ کیا ہوا تھا اور اس وقت روزے سے ہوں۔"

آنحضورؐ نے فرمایا، "آج تم سے کس شخص نے کسی مریض کی عیادت کی؟"

حضرت عمرؓ نے عرض کیا، "ہم نے تو ابھی نماز پڑھی ہے اور اپنی جگہ سے کھسکے بھی نہیں، مریض کی عیادت کیونکر کر سکتے ہیں۔"

حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا، "یا رسول اللہ! مجھے لوگوں نے بتایا تھا کہ عبدالرحمٰن بن عوف کو درد کی شکایت ہے۔ چنانچہ میں اُن کے گھر گیا۔ اُن کا مزاج پوچھا، پھر مسجد آگیا۔"

آنحضورؐ نے دریافت فرمایا، "تم میں سے آج کسی نے کوئی صدقہ کیا؟"

حضرت عمرؓ نے عرض کیا، "یا رسول اللہ! ہم نے جس وقت سے نماز پڑھی ہے آپ کے ساتھ ہی ہیں، صدقہ کیسے کرتے؟"

حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا، "یا رسول اللہ! میں جس وقت مسجد میں داخل ہو رہا تھا ایک سائل مانگ رہا تھا۔ عبدالرحمٰن بن ابو بکرؓ کے لڑکے

کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا۔ میں نے وہ لیا اور سائل کو دے دیا"۔

آنحضورؐ نے فرمایا" تمہیں جنت کی بشارت! تمہیں جنت کی بشارت!"

(حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے جب بھی کسی نیکی کے کام میں ابوبکرؓ سے سبقت لے جانے کی کوشش کی تو وہ مجھ سے آگے نکل گئے۔")

(حضرت علیؓ فرماتے ہیں،" کہ وہ (حضرت ابوبکرؓ) ہر ایک سے آگے نکل جانے والے تھے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جب بھی ہم نے کسی بھلائی کے کام میں ان سے سبقت کی کوشش کی، تو وہ سب کو پیچھے چھوڑ گئے۔)

حضرت صدیق کے جو اوصاف بیان کئے جاتے ہیں، آئیے! ان کو ہم ان نفسیاتی اصولوں کی کسوٹی پر پرکھ دیکھیں جن کو اس دور میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔

آپ کی جو خصوصیات و اوصاف بیان کئے جاتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ آپ عصبی المزاج تھے۔ مگر ایسے عصبی المزاج جس کی اٹھان موروثی شرافت کی گود میں ہوئی تھی۔ اور جس کے جذبات و احساسات پر شرافت کی مہر لگی ہوئی تھی۔

جو لوگ اس قسم کا مزاج رکھتے ہیں، وہ عام طور پر ذہن کی تیزی، سرعت تاثر، بلند پروازی کی امنگ، اعتقاد و ایمان کی شدت اور دعوت و تحریک

کے کاموں میں پیش قدمی کی وجہ سے ممتاز ہوتے ہیں۔

اس امر کا مشاہدہ آج کی ہر دینی یا اجتماعی و سیاسی تحریک میں کیا جا سکتا ہے۔ آج بھی ہر تحریک میں ایسے لوگ نمایاں نظر آتے ہیں۔ جن کا مزاج، جن کی عادات و اطوار، جن کی جسمانی حالت اور نفسیات سبھی کچھ حضرت ابو بکرؓ کے اوصاف سے یک گونہ مماثلت رکھتی ہیں۔ ایسے لوگ جس تحریک سے وابستہ ہوتے ہیں، اس کی پورے جوش و خروش اور ولولہ کے ساتھ پشت پناہی کرتے ہیں۔ اس کے لئے قربانیاں دیتے ہیں۔ اپنے رہنماؤں سے غیر متزلزل عقیدت رکھتے ہیں اور کسی قیمت پر بھی اپنی دعوت کے راستہ سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

اگر انسان کسی اونچے یا وجیہہ خاندان سے تعلق رکھتا ہو اور وہ اس مزاج کا حامل ہو تو اس کے اندر وقار و سنجیدگی اور صداقت و جرأت کے جذبات کا پایا جانا ضروری ہے۔

ہمارے علم کے مطابق حضرت ابو بکرؓ ایسی سخت گیر اور فرعونی شخصیت کے حامل نہیں تھے جس کو پہلی نظر دیکھ کر انسان گھبرا اٹھتا ہے۔ ان کے گھرانے کی لیڈری بھی ان جابرہ کی سیادت سے مختلف تھی، جو اپنی قوت طاقت اور دھونس کے بل بوتے پر لوگوں کی گردنوں پر مسلط ہو جاتے ہیں ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اپنی صداقت و مروت کے ذریعہ خاندانی اور موروثی

شرف و امتیاز کی حفاظت کرتے رہیں۔ اور ان دونوں اوصاف کو اپنے اندر مزید ترقی دینے کے لئے جدوجہد کرتے رہیں۔ مزاج و زبان کی لغزشوں سے پرہیز کرتے رہیں اور ہر ایسی چیز سے دور ہو کر گذریں جو وقار اور طہارت نفس کے منافی ہو۔ آپ سیادت کے جس مقام پر فائز تھے وہ سخت گیری یا ڈکٹیٹر شپ کے مقام سے بہت اونچا تھا۔

حضرت صدیق تند مزاجی میں معروف ہیں۔ یہ وصف عصبی المزاج لوگوں کا خاصہ شمار ہوتا ہے۔ مگر جن لوگوں کو اپنا وقار و شرافت زیادہ عزیز ہوتی ہے اور وہ عام طور پر اسی عادت پر غلبہ حاصل کر کے اس کا رخ کسی مفید و محمود کام کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ ہاں اگر عصبی مزاج شخص کی وہ رگ چھیڑ دی جائے جس پر اس کے مزاج اور اس کی عادات کی تعمیر ہوئی ہو تو ایسی حالت میں غصہ پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے اور تند مزاجی اپنی کمین گاہ سے دھاڑتی ہوئی باہر آجاتی ہے لیکن اس وقت اس کا ظاہر ہونا برا نہیں بلکہ مستحسن ہوتا ہے۔

اب ہم حضرت ابو بکرؓ کی زندگی کے ان واقعات کی طرف رجوع کرتے ہیں جو ان کی مشفقانہ عادات سے نہیں بلکہ غصہ اور تند مزاجی سے متعلق ہیں۔ ان تمام کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کے سب ایسے واقعات ہیں جن کا ظہور اس وقت ہوا جب کہ حق و صداقت کو ٹھیس پہنچی۔

یا ایمان ویقین پر ضرب پڑی۔ یا ایسا سلوک کیا گیا ہو وقار کو مجروح کرتا ہے سب سے زیادہ غصہ اور تیزی انہوں نے فجاوہ بن ایاس بن عبدیا لیل کی سزا کے معاملہ میں دکھائی اور اس پر زندگی بھر ندامت بھی کرتے رہے۔

مگر یہ دیکھنے جاہیئے کہ فجاہ نے کیا جرم کیا تھا جس کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ کا غصہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔

آپ غور کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس شخص نے اس کمین گاہ کو چھیڑ دیا تھا جہاں پلنگِ غیظ وغضب نہفتہ تھا۔

اُس نے امانت میں صریح خیانت کا ارتکاب کیا تھا۔ اُس نے ابوبکرؓ اور مسلمانوں کو دھوکا دیا تھا۔ اُس نے بے گناہ لوگوں کو تہ تیغ کرنے کا جرم شنیع کیا تھا۔ ایک صادق انسان کو جب اس قسم کا دھوکا دیا جاتا ہے جس میں غداری اور خونریزی دونوں جرائم شامل ہوں تو اس کے غضب کی حالت اتنی قاہر ہو جاتی ہے جس کا اندازہ عام حالات میں مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس اسلحہ لینے اس غرض سے آیا تھا کہ مرتدین کے خلاف جنگ کرے گا۔ مگر ہتھیار لے کر اُس نے بے گناہ مسلمانوں کا خون بہایا۔ وہ قتل غارتگری اور رہزنی میں مشغول ہو گیا۔ اس جرم کے بعد وہ گرفتار ہو کر آیا تو حضرت ابوبکرؓ نے اُس کو آگ میں ڈال دینے سے کم سزا دینا کافی نہیں سمجھا۔

ایک دوسرا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک یہودی عالم نے جس کا

نام فنحاص تھا، یہ آیت "من ذالذی یقرض اللہ قرضاً حسناً فیضاعفہ لہ اضعافاً کثیرۃ" حضرت ابو بکرؓ کے سامنے پڑھی اور اللہ اور نبیؐ کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ "اگر وہ اللہ ہم سے بے نیاز ہوتا تو ہمارا مال بطور قرض ہم سے نہ مانگتا جیسا کہ تمہارا نبی کہتا ہے۔ وہ تم کو سود سے روکتا ہے اور ہمیں سود دیتا ہے۔"

یہ ایک گہری ناقابل برداشت طنز تھی اور اس سے ایمان وعقیدہ کو مجروح کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ جس کو ایک باوفا مومن کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر انسان کو کسی معاملہ میں غصہ آتا ہے تو اس واقعہ پر ضرور آنا چاہئے۔

حضرت ابو بکرؓ اپنی قوم میں محبوب وہر دلعزیز بن کر زندہ رہے۔ عزیز واقارب ہی سے نہیں بلکہ غیروں کے ساتھ بھی محبت ورحمت کے ساتھ پیش آتے۔ مگر یہی رحیم وشفیق شخص جب اپنے بیٹے کو مشرکین کا ساتھ دیتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کے مقابلہ میں خود اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور یہی اس بات کو خیال کرنے لگتا ہے کہ کسی دوسرے مسلمان کو نہیں بلکہ خود اس کو اپنے بیٹے کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ یہ واقعہ جنگ بدر میں پیش آیا۔

آپ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن کا شمار عرب کے نامور بہادروں اور قریش کے کامیاب ترین تیر اندازوں میں ہوتا تھا۔ عبدالرحمٰن نے لشکر کفار سے آگے نکل کر دعوت مبارزت دی۔ اس دعوت کو لبیک کہنے کے لئے باپ اٹھ کھڑا ہوا، مگر رسول اللہ نے ان کو یہ کہہ کر روک دیا کہ "ہمیں اپنی ذات سے فائدہ حاصل کرنے کا موقع دو۔"

عبدالرحمٰن جب مشرف باسلام ہوئے تو انہوں نے والد سے کہا کہ "آپ بدر کے دن میرے سامنے آگئے تھے مگر میں نے عمداً آپ کو نظر انداز کر دیا۔"

باپ نے کہا، "اگر تم میری زد میں آجاتے تو ہرگز بچ کر نہ جاتے۔"

نرم خو صدیق رضؓ کے مزاج میں غصہ اور تیزی اس نوعیت کی تھی۔ اس لئے جب کہیں یہ ذکر آئے کہ حضرت ابوبکر رضؓ نے فلاں موقع پر سختی دکھائی یا غصہ کا اظہار کیا، تو ہمیں یہ اچھی طرح جان لینا چاہیئے کہ اس معاملہ میں کوئی ایسی چیز ضرور موجود ہوگی جو ایمان داذعان کو مجروح کرتی ہوگی یا شرافت اور وقار کو ٹھیس پہنچانے والی ہوگی۔ تیزی یا سختی کا ظہور اس شخصیت سے بے موقع و محل نہیں ہو سکتا۔

آپ کی جسمانی ساخت کمزور اور مزاج عصبی تھا۔ آپ ایک پاکیزہ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

آپ ایسے شخص تھے جس کو سیادت و قیادت کرنی بھی آتی تھی اور وقار اور شرافت کا دامن تھامے رکھنا بھی آتا تھا۔ اس لئے جو کچھ بھی آپ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے وہ مذکورہ اوصاف کے عین مطابق اور ان خصوصیات سے پوری طرح مربوط ہے۔ اس قسم کی جسمانی و ذہنی ساخت سے ایسے ہی عادات و اطوار کی توقع کی جا سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس ساخت والا آدمی تیز مزاج ہوگا، کردار کا مضبوط ہوگا، سریع التاثیر ہوگا۔ اس کے دل میں جذبات کا سمندر ہوگا۔ اپنے ایمان اور عقیدہ سے عشق رکھتا ہوگا۔ اور اپنے وعدہ میں سچا اور کھرا ہوگا۔ اس قسم کا مزاج

دیکھنے والوں کے اندر ہم بچشم خود آج بھی ان خصوصیات کا مشاہدہ کرتے ہیں اور گذشتہ ادوار کے لوگوں کے حالات بھی یقین کی حد تک اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ ان میں بھی خصوصیات موجود تھیں۔

ہم نے قدماء اور معاصرین کے اوصاف میں جو مشابہت اور مطابقت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اُس کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس طرح وہ پیمانہ ہمارے ہاتھ لگ جائے جس کے ذریعہ ہم اوصاف و خصوصیات کو ناپ کر ان کا ٹھیک ٹھیک وزن معلوم کر سکیں۔ جن اوصاف کو ہم پڑھتے ہیں اگر وہ ان اوصاف سے مطابقت کھائیں جو موجودہ دور میں بھی ہر آن دیکھے اور محسوس کئے جاتے ہیں اور جو اتنے ہی قدیم ہیں جتنی پرانی دنیا ہے تو اس سے یہی نتیجہ نکلے گا کہ وہ صحت کے پیمانہ میں پورے اترتے ہیں۔

اس دور میں ایک وبا خطرناک حد تک پھیلی ہوئی ہے جس کے انسداد کے لئے کوشش نہ کرنا فرض سے کوتاہی ہوگی۔ وہ یہ کہ سارا کمال اس بات میں ہے کہ جو کچھ سامنے آئے اُس کو جھٹلا دو یا شک کی نظر سے دیکھو۔ ویسے یہ بھی بڑی نادانی ہے کہ جو چیز آئے اُس کو صحیح تسلیم کرتے چلے جاؤ۔ حالانکہ نہ تو کسی چیز کو صحیح ماننا ہمیشہ جہالت ہوتا ہے اور نہ کسی چیز کو سرے سے جھٹلا دینا لازماً کوئی کمال ہوتا ہے۔

بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی چیز کو جھٹلا دینا جہالت و غفلت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک شے کی قدر و قیمت گھٹا کر بیان کی جاتی ہے۔ اور بازار کے اندر اس کے دام

اونے پونے بکاتے جاتے ہیں۔ درحقیقت اس طرز عمل کے پیچھے عبادت اور کند ذہنی
کام کر رہی ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر حضرت ابوبکرؓ کی ان نیکیوں کو لے لیجئے جن کے متعلق آنحضورؐ نے
سوال فرمایا اور اتفاق سے اس دن انہوں نے ہر ایک نیکی کسی صورت میں انجام بھی
دی ہوئی تھی۔

شک کے مارے ہوئے شخص کے چہرے پر اس واقعہ کو پڑھنے پر شک کی کیفیت
پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا اس کی نظر میں یہ واقعہ ایسا ہے جس کا ہونا ناممکن ہے یا کم از کم
اس فعل کا اعادہ بار بار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک اتفاقی امر تھا جو صرف ایک روز
ہو گیا۔

اگر یہ پوچھ لیا جائے کہ قبلہ یہ تردد اور شک و شبہ کیوں ہے۔ آپ اس واقعہ
کا یقین حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ راستہ ہی میں کیوں کھڑے ہو گئے۔ منزل تک تو چلتے
جائیے۔ اس سوال کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ تردد و شک سفاہت و حماقت
پر مبنی تھا۔ ورنہ یقین کا ثمرہ اتنا قریب تھا کہ بس ہاتھ بڑھا کر توڑ لینے کی دیر تھی۔

آئیے! اب اس امر پر غور کریں کہ اگر ہم اس واقعہ کی صداقت تسلیم کر لیں، تو کیا
صورت پیدا ہو گی۔ اور اس کو جھٹلا دیں تو کیا بنے گا۔ اگر ہم اس واقعہ کو صحیح مان لیں
تو صرف اس حقیقت کا اعتراف کریں گے کہ ایک ذہنی رہنما اور پیدائشی کریم النفس
نے اپنے ہادی اور نبیؐ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ جذبہ اتباع کے تحت اس

نے روزہ رکھا، مریض کی عیادت کی اور ایک فقیر کو اپنے پوتے کے ہاتھ سے لے کر روٹی کا ٹکڑا دیا۔

اس واقعہ کو عقل ممتنع اور ناممکن الوقوع نہیں سمجھتی بلکہ عقل ایسے شخص سے ایسی ہی توقع رکھتی ہے۔ خاص طور پر جب ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر اسلام اور جاہلیت دونوں ادوار میں کس طرح احسان اور فیاضی کا سلوک کرتے اور کس طرح بھلائی کی راہوں میں مال بہایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب وفات پائی تو فقر کے علاوہ کوئی سرمایہ پیچھے نہ چھوڑا۔

اگر ہم اس واقعہ کو جھٹلا دیں تو اس کے بعد ہمارے وہم و گمان کو کن کن وادیوں کی گشت کرنی پڑے گی اور ظن و تخمین کی کتنی ستم ظریفیاں ہم سے سرزد ہوں گی؟

اگر ہم جھٹلا دیتے ہیں تو لازماً یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ حضرت ابوبکرؓ نے آنحضورؐ کو غلط جوابات دیئے اور انہوں نے ایک ایسے موقع پر جہاں صداقت کا ثبوت دینا چاہیے تھا سچائی سے احتراز کیا۔ یہ بات تو ممکن ہو سکتی ہے —— اگرچہ واقعہ کی صورت میں کبھی پیش نہیں آئی —— کہ وہ دنیا کے ہر انسان کے ساتھ جھوٹ بول جائیں مگر یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ اس ہستی کے سامنے دروغ بیانی سے کام لیں۔ جس کی ہر معاملہ اور ہر مرحلہ میں تصدیق کی اور جس کے واسطے جان و مال سب کچھ لٹا دیا کون شخص ہے جو یہ مفروضہ قبول کر سکے گا؟ اور کون شخص ہے جس کے ذہن میں بھی یہ خیال گذرے کہ اس واقعہ کی تکذیب قرینِ عقل ہے یا اس کی تصدیق خلافِ عقل ہے؟

چلئے تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ اس واقعہ کے غلط ہونے کی وجہ جواز اور امکان موجود ہے لیکن جب ہم تشکیک کو آگے بڑھا کر نقطۂ عروج تک پہنچاتے ہیں تو یہ جواز دوبارہ ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم سراب پر کشتی چلانے کی حماقت کا ارتکاب نہ کریں۔ اس لئے کہ یہ وجہ جواز مان لینے کے بعد ہمیں ایک ایسی بات ماننی پڑے گی جو تقریباً محال ہے۔ وہ یہ کہ جو شخص اس موقع پر جھوٹ بولنے کی جرأت کرسکتا ہے اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی فطرت میں صداقت موجود ہے۔ ایسے شخص کا جھوٹ عام لوگوں کی نگاہوں سے زیادہ دیر پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ دروغ گوئی کے باوجود حضرت ابوبکرؓ کا صداقت میں مشہور اور وفاشعار ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ حالانکہ شخصی ضمانتوں اور اجتماعی جرمانوں میں آپ کی شہرت آج تک بے مثال سمجھی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی جعل سازی زیادہ دنوں تک ڈھکی چھپی نہیں رہ سکتی۔ اور یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ جاہلیت سے اسلام تک کے طویل عرصہ میں یکساں شہرت کے مالک رہیں۔

ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے اس عقل پر جو اتنی موٹی سی بات نہیں سمجھ پاتی کہ ایک رہنما جو انبیاء سے مشابہت رکھتا ہے ان کا اپنے ایام روزے سے گزار دینا، مریضوں کی عیادت کرنا اور کسی مسکین کو روٹی کا ٹکڑا دے دینا ہرگز انوکھی بات نہیں۔ جب کہ وہ اس سے پہلے بھی ہزاروں کو دیتا رہا ہو، ہزاروں تنگ دستوں کو تنگ دستی کے پنجہ سے نجات دلاتا رہا ہو اور ہزاروں کا ضامن بنتا

رہا ہو۔

ہمارے نزدیک کسی وصف کو جھٹلا دینا اتنا آسان نہیں ہونا چاہئے جتنا عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے۔ بلکہ اگر حقائق سے اوصاف کی تائید ہوتی ہو اور ان کو آج کے دور میں بھی انسان دیکھتا اور محسوس کرتا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ کسی وصف کو صحیح تسلیم نہ کیا جائے۔

حضرت صدیق رضؓ کے اوصاف کو نقل کرنے والوں نے جس طرح نقل کیا ہے اور سمجھنے والوں نے جس طرح سمجھا ہے وہ عام طور پر اس قسم کے ہیں جس طرح بیان کئے گئے ہیں۔ قدماء نے متفرق اوصاف بیان کر دیئے مگر ان کے پیش نظر یہ نہیں تھا کہ بعد میں ہم ان کو جمع کریں گے اور نہ ہی ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ ہم ان اوصاف کو علم النفس اور واقعاتی زندگی کے معیار پر رکھ کر جانچیں گے۔

ہم نے ان اوصاف کو جمع کیا اور ان کو علم النفس کے معیار پر پرکھا تو ان کے درمیان اتنی ہم آہنگی اور مناسبت پائی کہ ان کی تصدیق کئے بغیر چارہ نہ رہا اور ان کی عدم صحت کا ہر شک زائل ہو گیا۔

حضرت ابو بکر رضؓ جیسا کہ لوگوں نے بیان کیا ہے یقینی طور پر ایسے عصبی المزاج افراد میں سے تھے جو شرف و وقار کے گہواروں میں پرورش پا کر اٹھتے ہیں۔ ان کے متعلق لوگوں نے بیان کیا ہے کہ وہ مال لٹا دیا کرتے تھے۔ ہم کہتے ہیں کہ ان کو اپنے مزاج کے مطابق مال لٹا ہی دینا چاہئے تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ جلد نرم اور جلد گرم

ہوجاتے تھے۔ہم کہتے ہیں کہ ان کے مزاج کے لئے یہ بات انوکھی نہیں۔لوگوں نے آپ کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہ وضعداری اور وقار و سنجیدگی کا مجسمہ تھے۔ہم کہتے ہیں کہ اس قسم کے مزاج کا وضعدار اور باوقار و سنجیدہ ہونا نئی بات نہیں۔لوگوں نے بیان کیا ہے کہ وہ اپنے عقیدہ میں بڑے سخت تھے۔حقیقت بھی یہی ہے۔ہم نے جو کچھ دیکھا یا سنا ہے اس کے مطابق یہ اعتقاد اپنی نوعیت میں واحد ہے۔مگر یہ بات بھی تعجب انگیز نہیں اس لئے کہ اس کے خلافِ واقعہ ہونے کا کوئی ثبوت ہمیں نہیں ملتا۔

اگر عقل ایک سرمایہ ہے تو اس سے اسی صورت میں فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے جب ہم اوصاف کو استقرار کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کریں اور دیکھیں کہ راویوں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا مجمل مفہوم کیا ہے۔اور اگر عقل بے مائیگی کا نام ہے تو پھر ہم کسی مجسم حقیقت کو بھی نہ سمجھنے میں واقعی حق بجانب اور معذور ہیں۔

شخصیت کا راز

حضرت ابوبکرؓ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، نحیف و لاغر، کمزور جسم و جثہ اور چھوٹے قد و قامت کے انسان تھے۔ اس ساخت کے افراد عام طور پر مذکورہ ذیل دو اوصاف میں سے کسی ایک وصف میں نمایاں مقام پیدا کرتے ہیں۔

اگر ان کا حسب و نسب شریف ہوتا ہے تو ان کے اندر بالطبع اپنے قائد سے غایت درجہ عشق و گرویدگی، والہانہ لگاؤ اور محبت اور اس کی اتباع کامل کا ولولہ پایا جاتا ہے۔

اگر رذیل اور پست اصل و نسل سے تعلق رکھتے ہیں تو بالعموم حسد و رشک اور جلن و گھٹن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس قماش کے لوگ ایک ہیرو کے اندر پائی جانے والی خصوصیات اور خوبیوں کے تو دل سے مداح و معترف ہوتے ہیں مگر وہ اپنی فطرت سے مجبور ہوتے ہیں اور یہ نہیں پسند کرتے کہ یہ خصوصیات اور خوبیاں ان کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب ہوں۔ جب کسی ہیرو کی طرف سے اعلیٰ اوصاف

کا مظاہرہ ہوتا ہے تو وہ اس کو حسد و رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس سے عناد اور دشمنی پر تل جاتے ہیں اور بعض اوقات اس کے درپے آزار ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ شریف حسب ونسب کے مالک، کریم النفس، نیک طینت، بہی خواہ اور غمگسار شخص تھے۔ اس لئے مذکورہ بالا نفسیاتی اصول کے مطابق آپ کے اندر ان اوصاف وخصوصیات کا پایا جانا ناگزیر تھا جن کو ہیرو کا عشق و محبت اس کی ذات پر پورا یقین و اعتماد اور اس کی اتباع کا بے لوث جذبہ و ولولہ جیسے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ کا یہی وصف درحقیقت آپ کی شخصیت کی کلید ہے۔ جو آپ کے محرکاتِ عمل کی تمام پیچیدہ گتھیوں کو ایک ایک کر کے کھول دیتی ہے اور آپ کی شخصیت کو دوسری شخصیات سے علیحدہ مقام عطا کرتی ہے۔

ہم اس سے پہلے اپنی کتاب "عبقریت عمر" میں کہہ چکے ہیں کہ "شخصیت کی کلید جو بظاہر چھوٹی اور معمولی چیز نظر آتی ہے نگارخانہ زندگی کے تمام دروازے ہمارے سامنے اس طرح وا کر دیتی ہے کہ ہم اندر جا کر سب کچھ بلا تکلف مشاہدہ کر سکتے ہیں۔"

ہم اپنی اس کتاب میں یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ "یہ کلید ہمارے لئے صرف اسی حد تک مفید ہے کہ ہم اس کے ذریعہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جائیں۔ اگر ہم خود کلید ہی کے ذریعہ اندرون خانہ کا طول و عرض ناپنا شروع کر دیں یا باہر سے داخلی

نقش و نگار ڈھونڈنا شروع کر دیں تو یہ ایک لاحاصل اور بے سود کوشش ہو گی۔"

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حضرت صدیق رضؓ کی شخصیت کی کلید یہ ہے کہ ان کے اندر اپنے ہیرو اور قائد سے عشق و محبت کا والہانہ جذبہ اور اس کے اتباع اور پیروی کا گہرا جوش و ولولہ موجود تھا۔

اس گرویدگی کا رنگ ان کے جملہ اعمال اور ارادوں پر پوری طرح چڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کی کسی بھی رائے اور مشورے یا منصوبہ اور سکیم کو لے لیجئے، آپ کو ہر ایک کے اندر یہ رنگ ضرور نظر آئے گا۔

اپنے ہیرو سے گرویدگی و محبت کا وصف جو اونچا مقام رکھتا ہے انسان کی تاریخ اس کو اگر خود ہیرو شپ کے برابر نہیں تو اس کے بعد کا درجہ ضرور دیتی ہے۔ یہ دونوں اوصاف (ہیرو ورشپ اور ہیرو شپ) ہمیں تاریخ کے عظیم معرکوں میں دوش بدوش چلتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا دامن دوسرے سے جدا کبھی نہیں پایا گیا۔

علمی تحلیل و تجزیہ کے شائقین اور منطقی ربط و تعلق ڈھونڈنے والے اس باب میں خواہ جو کچھ بھی کہیں مگر وہ اس تاریخی حقیقت پر کیسے پردہ ڈال سکتے ہیں کہ دنیا کا کوئی عظیم کارنامہ آج تک ان دونوں اوصاف کی ہم آہنگی کے بغیر انجام نہیں پایا اگر ان حضرات کے پاس تحلیل و تجزیہ اور تجربہ کی بنا پر قوی دلائل ہیں تو دوسری طرف

واقعات کا ایسا ناپیدا کنار سلسلہ ہے جو اپنی جگہ خود ہر دلیل سے بڑھ کر قوی تر دلیل ہے۔

اگر ایک شخص اپنے باطنی یقین و اذعان سے مجبور ہو کر اپنے ہیرو کا گرویدہ ہوتا اور اس کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے ہر آن تیار کھڑا رہتا ہے تو اس کے متعلق یہ کہنا ہرگز درست نہیں ہو سکتا کہ وہ بہر صورت اندھی تقلید کر رہا ہے یا اس نے اپنی بصیرت کی آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہے۔ یہ تصور اس لئے جائز نہیں کہ اس شخص کی عملی زندگی اور اس کے کارنامے خود اپنی جگہ ایسا اٹل ثبوت پیش کرتے ہیں کہ اس کے بعد تحلیل و تجزیہ کی فیکٹری یا منطق کی خراد کو معیار تسلیم کرنے پر اصرار کرنا عقل و دانش سے دشمنی کے مترادف ہے۔

مثال کے طور پر آپ ان واقعات کو لے لیجئے جو دعوت محمدیؐ کے ابتدائی دور میں پیش آئے۔ ان میں سے بعض واقعات بڑے ہی عجیب و غریب نظر آتے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے ان کو سنا مگر سن کر ٹھٹکے جھجکے نہیں۔ نہ ہی ان کی پیشانی پر شک و ریب کے آثار ظاہر ہوئے۔ وہ آگے بڑھے اور ان واقعات کو بے چون و چرا مان لیا۔ اس لئے کہ وہ صاحب دعوت کو صادق سمجھتے اور اس سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔

فرض کیجئے کہ حضرت ابو بکرؓ تحلیل و تجزیہ کی فیکٹری میں انہیں لے جاتے اور فیکٹری کہتی کہ مجھے تو اس قسم کے اعجوبوں سے کبھی سابقہ نہیں پڑا، اس لئے میں ان کی

تصدیق و تردید کرنے سے قاصر ہوں۔ ادھر سے ناکام ہو جانے کے بعد حضرت ابوبکر منطقی مقدمات کی طرف رجوع کرتے اور یہ مقدمات یہ فیصلہ صادر کر دیتے کہ یا عجوبے ہمارے مقرر کردہ سانچوں میں فٹ نہیں بیٹھتے۔

تحلیل و تجزیہ کی فیکرٹی نے تعطل کی کیفیت پیدا کر دی منطقی مقدمات نے میدان میں آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اب حضرت ابوبکرؓ کے لیے چپ سادھ کر بیٹھ رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔

یہ بھی فرض کیجئے کہ وہ مذکورہ بالا تاثر لیتے اور بیٹھ جاتے۔ ایسی صورت میں حضرت ابوبکرؓ کی ذات سے جزیرہ نمائے عرب کو جو نقصان عظیم پہنچتا اس کی تلافی کیوں کر ہو سکتی؟ پھر عالم انسانی کے علم و عقل، تحلیل و تجزیہ اور منطقی مقدمات و قضایا کو اس بے عملی سے کیا فائدہ پہنچتا؟

اگر حضرت ابوبکرؓ یہ مفروضہ پوزیشن اختیار کر لیتے تو آج دنیا میں ان کا نام ایک مصلح اور کامیاب انسان کی حیثیت سے تو دور کنار، ادنیٰ اور معمولی انسان کی حیثیت سے بھی نہ سنا جاتا۔

ہماری اس بحث سے کوئی شخص یہ مطلب نہ نکالے کہ کچھ کرتے رہنا شک کی حالت سے بہر حال بہتر ہے۔ ہمارا ہرگز یہ منشا نہیں۔

ہم صرف یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ شک خود ایک غلطی ہے اور اس کے غلط ہونے کی دلیل نفسیاتی ہے جو اتنی ہی وزنی ہے جتنا کوئی علمی تحلیل یا منطقی قضیہ ہو

سکتا ہے۔ ہیروشپ کو اپنی قدر و منزلت ثابت کرنے، اپنی گرویدگی کا حق منوانے اور تاریخ میں اپنا مقام جتانے کے لئے کسی تجزیہ و تحلیل کی فیکٹری میں داخل ہونے کی ضرورت و حاجت نہیں پیش آتی۔ اس کا اصل مقام فیکٹری نہیں بلکہ انسان کا قلب اور اس کے نفس کی گہرائیاں ہیں۔

کیا کسی ہیرو کو میرے ذہن و دماغ پر تسلط حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ پا ئیوں اور منگیوں کے راستے سے ہو کر میرے سامنے حاضری دے؟ کیا میں ہیرو کی گرویدگی کا حق اس وقت تک ادا نہیں کر سکتا جب تک میرے ہاتھ میں ایساغوجی کی سند نہ ہو۔

جس وقت ایک آزاد پرندہ میرے سامنے سے پرواز کرتا ہوا گذرتا ہے اور اپنے بال و پر کی رعنائیوں، پرواز کی دلکشی اور اپنے سامعہ نواز زمزموں سے میرا من موہ لیتا ہے اور میں اس سے پیار کرنے لگتا ہوں تو میرے لئے کیا یہ ضروری ہوتا ہے کہ میں گرویدہ ہونے سے پہلے گرویدگی کی وجہ معلوم کر لوں؟ اسی طرح اگر روح عظیم میرے سامنے اپنی دلربا ادا کے ساتھ جلوہ گر ہو تو کیا میرے لئے اُس سے یہ کہنا ضروری ہے کہ "اے روح عظیم! ٹھہر جا!! میں ذرا اپریشن ٹیبل پر

---

[1] منطق کی مشہور کتاب ہے جس کو درس نظامی میں اب بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔

تیری تشریح اعضا کر لوں یا ٹیسٹنگ ٹیوب میں رکھ کر تیرا معائنہ کر لوں۔ پھر آگے گفتگو کروں گا۔

روح عظیم کے سامنے دنیا کے کسی فرد کو اس قسم کی حماقت آمیز گفتگو کرنے کی آج تک جرات نہیں ہوئی۔ سبب واضح ہے۔ روح عظیم اپریشن ٹیبل اور ٹیسٹنگ ٹیوب سے قدیم ہے۔ پھر یہ بھی کہ انسانیت کو یہ الہام کبھی نہیں کیا گیا کہ جب تک ماہرین تشریح اعضا اور ماہرین تحلیل و تجزیہ پیدا ہو کر اپنا فیصلہ نہ صادر کر دیں تم اس وقت تک کسی روح عظیم سے عشق و محبت کرنے کی غلطی نہ کرنا۔

ان لوگوں کے پیدا ہونے سے کوئی نقصان نہیں۔ وہ پیدا ہوں اور ان کی افزائش میں روز افزوں ترقی ہو، مگر روح عظیم اپنی عظمت کا حق وصول کرنے کے لئے ان کے وجود یا عدم وجود کی محتاج نہیں۔

یہاں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ جو بات اوپر بیان کی گئی ہے اس کا علم و منطق سے کوئی تعلق نہیں مگر ذرا گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو اس خیال کی غلطی جلد ہی واضح ہو جائے گی۔ علم و منطق اس کا نام نہیں کہ نفس انسانی کے داعیات اور تقاضوں اور محرکات فطرت کا دامن خواہ مخواہ ایسی چیز کے ساتھ باندھ دیا جائے جس کے ساتھ بندھ جانے کے بعد وہ بالکل اٹل بے جوڑ نظر آنے لگیں۔ پھر یہ بات بھی اپنی جگہ درست نہیں کہ ہم کسی واقعہ کی تہہ تک پہنچنے کے لئے عمل تجزیہ بھی ضرور کریں جب کہ اس واقعہ کا خود واقعہ کی صورت میں موجود ہونا اس کی صحت کی سفارش کرنا

ہو۔

لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بدیہی راستے اور وجدان عشق کی راہ و منزل میں بھٹک سکتے ہیں اور ایسا ہوتا بھی رہا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ ہاں ایسا ہو سکتا ہے اور ایسا ہوتا بھی رہا ہے۔لیکن بعینہٖ اسی طرح عقل بھی تو ٹھوکر کھا جاتی ہے۔تجربہ بھی غلط خطوط پر چل پڑتا ہے۔علوم بھی غلط راہوں پر ٹامک ٹوئیاں مارتے دیکھے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود آج تک کسی کی زبان سے یہ کہتے نہیں سُنا گیا کہ صحیح علوم کو اس لئے رد کر دینا چاہیئے کہ وہ ایک سے زیادہ دفعہ گم گشتہ راہ رہے ہیں۔ہر ذہن یہی سمجھتا ہے کہ ان علوم کی غلطی وقتی آزمائشی اور تجرباتی تھی جو آگے چل کر دور ہو گئی۔

علمی اور منطقی قضایا و مقدمات کی نوعیت کچھ اور ہے اور عادات و اطوار کو نفسیاتی پہلوؤں سے سمجھ لینے کی نوعیت کچھ اور۔یہ بات تو سمجھ میں آسکتی ہے کہ حضرت صدیقؓ کو وہ کتابی وسائل کم حاصل رہے ہوں جو موجودہ دور کے ماہرین تحلیل و تجزیہ کو منطقی اور علمی خدمات کے باب میں میسر ہیں لیکن یہ بات فہم سے بالاتر ہے کہ عادات و شمائل کے نفسیاتی تجزیہ کے غیر کتابی وسائل بھی حضرت صدیق کو کم حاصل تھے۔وہ اپنے ارد گرد نفسِ انسانی کی عظمت کو جس طرح محسوس کر سکتے تھے، وہ موجودہ دور کے ماہرین کے احساس سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا حضرت صدیقؓ نے فرمایا "یہ ایک عظیم نفس ہے جس کی عظمت شک و شبہ

سے بالا تر ہے۔"

اس لئے عقل و دانش کا تقاضا یہی تھا کہ اس عظیم نفس کے نقش پا کی حرف بحرف پیروی کی جائے۔

حضرت صدیقؓ کا مذکورہ قول ہر اعتبار سے صحیح اور درست ہے۔ علم و منطق بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ احساسات و جذبات بھی اس سے ہم آہنگ ہیں اور صحت و صواب کے پیمانہ میں بھی یہ پورا اترتا ہے۔

حضرت صدیقؓ کو اپنے ہیرو کے ساتھ جو گرویدگی تھی درحقیقت وہی اُن کی مشعل بردار تھی۔ یہ گرویدگی اس وجہ سے نہ تھی کہ ان کا ہیرو ظاہری چمک دمک اور دولت و سطوت کا مالک تھا۔ اس لئے بھی نہ تھی کہ ہیرو اپنے آگے پیچھے لاؤ لشکر رکھتا تھا۔ اور اس لئے بھی نہ تھی کہ ہیرو قبائل کا سردار یا شیخ تھا۔

رسول اللہؐ کی ہیرو شپ اس قسم کے شائبوں سے پاک تھی۔ آپ صاحب سطوت و جبروت ہونے کی بجائے وقت کے جبابرہ کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق تھے جلو داروں کا ہجوم آپ کی معیت میں کہاں سے ہوتا۔ آپ اس وقت ایک فقیر بے نوا سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ آپ کے پاس دولت و ثروت کی فراوانی اور دنیوی عز و جاہ کا سرمایہ بھی نہ تھا۔ آپ اگر کسی دولت سے سرفراز تھے تو وہ پیغام حق کی دولت تھی اور یہی چیز صدیقؓ کے لئے ہر قدم پر تصدیق کا باعث و محرک بنی۔

جس ہیروشپ کے دام میں صدیقؓ گرفتار ہو گئے تھے اس کی مثال پیش کرنے سے انسانیت کی پوری تاریخ قاصر ہے۔ یہ ہیروشپ سرتاسر حق، خیر کل اور استقلال و استقامت کی کامل تصویر تھی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ اپنے اندر گرویدگی اور کشش کا ہر پہلو رکھتی تھی۔ اس ہیروشپ کی ہمنوائی کا گناہ وہی شخص کر سکتا ہے جو طاقتور جہلا کے جور و ستم کو ہنس کر سہار جانے کا بل بوتا اپنے اندر رکھتا ہو۔

اس لافانی ہیروشپ کے گرویدہ اور شیدائی تھے حضرت صدیقؓ!

اس گرویدگی نے ان کی زندگی کا نقشہ بدل دیا۔ ان کی قوتوں اور صلاحیتوں کے نشو و ارتقاء کا رُخ پھیر دیا۔ ان کے قلب کی گہرائی میں اتر کر زاویۂ نظر و فکر میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ ان کی سیاسی، معاشرتی اور اجتماعی زندگی کا خاکہ تبدیل کر دیا۔

کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ کفار قریش ان کے گرد جمع ہو کر کہنے لگے۔ "کیا اب بھی تم اپنے دوست کے عشق میں مبتلا رہو گے۔ تمہارا دوست اب یہ کہنے لگا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو رات کی تاریکیوں میں بیت المقدس لے گیا تھا۔"

یہ بات اس سے پہلے دوسرے بہت سے لوگ سن کر مرتد ہو چکے تھے لیکن یہی بات جب حضرت ابو بکرؓ نے سنی تو فرمایا، "اگر انہوں (آنحضورؐ) نے یہ بات فرمائی ہے تو اس کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں۔"

سائل یہ دیکھ کر حیران تھے کہ جو چیز ان کی نگاہ میں ماورائے تصدیق ہے، وہ ابوبکرؓ کے لئے ادنیٰ موجب شک و ریب بھی ثابت نہ ہوئی۔ وہ پھر حضرت ابوبکر سے ہم کلام ہوئے اور پوچھا کہ "کیا یہ بات تمہاری عقل صحیح تسلیم کرتی ہے کہ وہ رات ہی رات بیت المقدس گیا اور صبح ہونے سے پہلے واپس آگیا؟"

حضرت صدیقؓ نے فرمایا: اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بھی زیادہ بعید از قیاس و ظن بات فرمائیں اور یہ کہیں کہ "میں نے آسمانوں کو صبح و شام میں طے کر لیا تو جب بھی میں آپ کو صادق مانوں گا اور یہ میرے لئے کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوگی"

اس واقعہ کے بعد وہ رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضورؐ جو کچھ ارشاد فرماتے جاتے وہ اس کو صمیم قلب سے سنتے جاتے اور کہتے جاتے "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ خدا کے فرستادہ ہیں"۔

اسی کا نام وہ نفسیاتی دلیل ہے جس کی طرف ہم اس سے پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ مدعیانِ علم اور اصحابِ منطق خواہ اس دلیل کے عادی ہوں یا نہ ہوں مگر ان کے عادی ہونے یا نہ ہونے سے اسکی قوت و صحت میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔

حضرت صدیقؓ فرماتے ہیں کہ" اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بھی زیادہ بعید از قیاس و ظن بات فرمائیں اور کہیں کہ میں نے آسمان کی مسافت صبح و شام میں طے کر لی تھی تو جب بھی میں ان کو صادق مانوں گا"۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق بہر حال کروں گا۔

اس لئے کہ وہ صادق سمجھے جانے کے مستحق ہیں۔ ایمان و اذعان، یقین و اعتماد کی رو سے دیکھا جائے تو یہ جاننے میں دشواری نہ ہو گی کہ یہ جذبہ و شوق انسان کے اندر شرح صدر اور طمانیت قلب پیدا کرنے کے سلسلے میں اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ اگر یہ وصف پیدا کرنے کے لئے منطق و تجزیہ کے پاس کوئی اساس یا دلیل ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ دونوں اساسیں ایک دوسرے سے متناقض ہیں۔ راستے تو جدا جدا ہو سکتے ہیں مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ منزل بھی لازماً جدا جدا ہو۔ اور اگر یہ دونوں اساسیں ایک دوسرے سے متناقض بھی فرض کر لی جائیں، تو اس مفروضے سے بھی دامن حضرت صدیقؓ کا نہیں بلکہ اس شخص کا داغدار ہوتا ہے جو اپنے آپ کو علم و منطق اور تجزیہ کا ماہر خیال کرتا ہے۔

اگر کوئی منطقی یا ماہر تجزیہ یہ کہے کہ میں حدیث اسراء کو غلط سمجھتا ہوں اسی حدیث کو بنیاد بنا کر میں اسلامی دعوت سے بھی انکار کرتا ہوں اور محمدؐ کی عظمت بھی میری نگاہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتی تو کیا یہ عقل و دانش کا ایک عظیم المیہ نہ ہو گا اور دلیل و قیاس کی دنیا میں اس کو ایک سانحۂ عظیم سے تعبیر نہ کیا جائے گا؟ اس موقع پر ہر صاحب فہم یہی کہے گا کہ اس منطقی یا ماہر تجزیہ نے جہالت کا ثبوت دیا۔ اس نے استدلال کا جو راستہ اختیار کیا وہ سفاہت اور نادانی پر مبنی تھا۔ اور اس نے قیاس کرتے وقت یہ نہیں دیکھا کہ قیاس کی حدود کہاں پر جا کر ختم ہو جاتی ہیں جن سے آگے قدم بڑھانا خطرناک ہے۔

اس کے برعکس حضرت صدیق رضؓ نے اس مسئلہ کو اس کے جامع اور ہمہ گیر پہلو سے دیکھا اور صحت و صواب کے کنارے آ لگے۔ انہوں نے ایک عظیم شخصیت کا پورا مجموعہ اپنے سامنے رکھا اور جب یہ دیکھ لیا کہ یہ صحیح سمجھے جانے کے قابل ہے تو بلا تامل اس کی تصدیق کی۔ اور اس کے بعد اس کے حصے بخرے کرنے یا اپریشن کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ انہوں نے دیکھا کہ جڑ میں کوئی خرابی نہیں اس لئے اس کے پورے برگ و بار پر ایمان لے آئے۔ ان کے نزدیک بنیادی سوال صلاح و فساد اور خیر و شر کا تھا۔ توحید و اصنام پرستی کے حسن و قبح کا تھا۔ اسلامی اور جاہلی اخلاق کے منبع و ماخذ کا تھا۔ مستحسن مساعی اور جہالت کوشی میں فرق و امتیاز کا تھا۔ جب یہ سوال حل ہو گیا تو وہ مطمئن ہو گئے۔

اگر ایک ماہر تجزیہ یا منطق اس اساس کو نہ پا سکا تو یہ اس کی اپنی فکر کی کم مائیگی ہے۔ اس نے قیاس کو اس بنیاد پر نہیں اٹھایا جس پر اٹھانا چاہیے تھا۔ حالانکہ اس کا فرض تھا کہ وہ مقصد تک پہنچ جاتا خواہ اس کے لئے اس کو ایمان و احساس سے کام لینا پڑتا یا فکر و تجزیہ سے۔

فرض کر لیجئے کہ ماہر تجزیہ، منطقی اور صدیق رضؓ تینوں دس سال کے بعد بارگاہ سرمدی میں حاضر کئے جاتے ہیں۔

ماہر تجزیہ یا منطقی سے سوال کیا جاتا ہے کہ آج سے دس سال پہلے تم نے کیا کچھ سنا تھا؟

وہ جواب دیتا ہے کہ "میں نے سنا تھا کہ محمدؐ مکہ سے بیت المقدس تک کا سفر رات بھر میں طے کر گئے۔ مگر مجھے اس دعویٰ کی صداقت پر کوئی دلیل نہیں مل سکی۔"

اُس سے دوبارہ پوچھا جاتا ہے "پھر تم نے کیا کیا؟"

اُس کی طرف سے جواب دیا جاتا ہے "میں نے محمدؐ کی تکذیب کی۔ اسلامی دعوت کی مخالفت کی اور آج تک جاہلی سنت ہی پر قائم ہوں۔"

یہ جواب سن کر بارگاہ سرمدی سے آواز آتی ہے "تم نے غلط راہ اختیار کی تم نے علم "منطق" کا صحیح استعمال نہ کیا۔ حدیث اسراء کے تم جو معنی بھی سمجھو اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ نفسِ عظیم اور اس کے عملِ عظیم کا انکار بہرحال قابلِ گرفت ہے۔"

اس کے بعد بارگاہ سرمدی حضرت صدیقؓ سے مخاطب ہوتی ہے اور پوچھتی ہے کہ "آج سے دس سال پہلے تم نے کیا کیا؟"

آپ جواب دیتے ہیں "میں نے سنا تھا کہ محمدؐ نے ایک رات میں مکہ سے بیت المقدس تک کا سفر طے کیا۔ مجھے یہ بات مان لینے میں کوئی شک وریب لاحق نہیں ہوا اور میں نے اس خبر کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔"

بارگاہِ عظیم پوچھتی ہے "تمہارے دل و دماغ پر شک وریب کا حملہ کیوں نہ ہوا؟"

آپ جواب دیتے ہیں "میں جب اس ہستی کی سنائی ہوئی آسمانی خبروں کی تصدیق کر چکا تھا تو میرے لئے اس کی باقی باتوں کی تکذیب کرنے کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہ گیا تھا۔"

بارگاہ پھر پوچھتی ہے "تم نے اس کی سُنائی ہوئی آسمانی خبروں پر کیوں اعتماد کر لیا؟"

آپ جواب دیتے ہیں "اس لئے کہ اس کی پاکبازی اور اس کے مخالفین کی بدکرداری مجھ پر روزِ روشن کی طرح عیاں تھی۔"

بارگاہ ربانی کی طرف سے کہا جاتا ہے "تم نے حقیقت پالی اور تصدیق کے لئے موزوں ترین راستہ اختیار کیا۔ تم نے فنی علم و منطق کو سب سے آخر میں استعمال کیا اور راستہ ہی میں الجھ کر نہیں رہ گئے۔ یہ دس سال تمہارے اعتدالِ فکر و نظر اور تمہارے مخالفین کی کج فہمی اور غلط روی کے شاہد ہیں۔ تم نے علم و منطق کے استعمال میں نتیجہ کو زیادہ اہمیت دی اور مقدمات کی ترتیب کی کچھ پروا نہ کی۔ تمہارے مخالفین مقدمات ہی کے چکر میں گرفتار ہو کر رہ گئے اور نتیجہ ان کی نظروں سے اوجھل رہا۔ تم ہی ہدایت یافتہ ہو۔"

ہماری ان باتوں سے یہ غلط فہمی نہیں لاحق ہونی چاہیئے کہ ہم بھی ان لوگوں کے ہم نوا ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ "کامیابی ہی کسی چیز کے بہتر ہونے کی دلیل ہے۔ ہم اس نظریہ پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ ہی ہماری مذکورہ بالا گفتگو کا یہ منشاء و مدعا

ہے۔ ہم محض اور صرف یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ابوبکرؓ محمدؐ کی عظمت کے راز کو ان لوگوں سے بدرجہا زیادہ بہتر طریق پر سمجھتے تھے جنہوں نے حدیث اسراء کو مستبعد خیال کرکے اس سے انکار کر دیا۔

علم و منطق کا فیصلہ یہ ہرگز نہیں کہ محمدی دعوت کی محض اس لئے مخالفت کی جائے کہ کچھ لوگوں کا فہم حدیث اسراء سمجھنے سے قاصر رہا۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ علم و منطق کا فیصلہ تو یہی ہے کہ حدیث اسراء اگر سمجھ میں نہیں آئی تو دعوت کی مخالفت ضرور کرنی چاہیئے۔ اس کے جواب میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ تم علم و منطق پر ستم ڈھا رہے ہو۔ تمہارے پاس اپنے دعووں کے ثبوت میں کوئی دلیل نہیں اور ساتھ ہی نفسیاتی دلیل کو نہ سمجھنے کی نادانی کا ارتکاب بھی کر رہے ہو۔

ہم علم و منطق کے دلائل کو باطل اور لغو نہیں سمجھتے بلکہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نفسیاتی دلائل ان سے زیادہ قوی اور طاقتور ہیں۔ یہ اپنے دائرہ وسعت میں تمام انسانی عظمتیں کو سمیٹے ہوتے ہیں اور علم و منطق بھی اس بحیط بے کراں کا ایک قطرہ ہیں۔

یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ یہ جو تم نے نفسیاتی دلائل و براہین کی رٹ لگا رکھی ہے اس کا واضح مطلب کیا ہوا؟

کیا جو شخص بھی ان دلائل کا دعویٰ کر دے ہم بے چون وچرا اس کی تصدیق کر دیں؟ جہاں کہیں بھی یہ دلائل نظر آئیں ہم آنکھیں بند کرکے ان پر آمنا وصدقنا کہیں؟

جب بھی کوئی شخص کسی ہیرو سے اپنی گرویدگی کا اظہار کرے ہم اس کی عظمت کے قائل ہو جائیں؟

ان سوالات کا مختصر جواب یہ ہے کہ خوبروؤں کو اپنا حسن وجمال ثابت کرنے کے لیئے منطق و فلسفہ یا عالم تجربہ کی خاک چھاننے کی ضرورت نہیں کسی چہرہ کا حسین ہونا بذاتِ خود اس کے حسن وجمال کا معیار بھی ہے اور دلیل بھی ؎

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

جب کوئی عظیم شخصیت اپنی ظاہری و باطنی رعنائیوں کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہے، تو اس کا درخشاں اور ضیاء بار چہرہ خود آیات و براہین ہوتا ہے کچھ لوگ تو فوراً اس کی پرکشش شخصیت کو دیکھ کر اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ اس کی آب و تاب دیکھ کر خیرہ چشم ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ نفرت و بیزاری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

ہم نے اوپر جو کچھ بیان کیا ہے اگر اسی پر اکتفا کریں تب بھی بات کی وضاحت تو ہو جاتی ہے تاہم عقل کو مطمئن کرنے کے لیئے چند اور دلائل پیش کرتے ہیں، جن کا ماخذ خود حضرت صدیقؓ کا کلام ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

"دو عادتوں میں سے جس ایک سے تمہارے نفس کو نفرت ہو وہی تمہارے حق میں بہتر اور نفع بخش ہے۔"

جو دعوت ہمیں محو غفلت و خواب کر دے، جو دعوت ہمارے قویٰ میں ضعف اور

ناتوانی پیدا کر دے اور جو ہمیں سہل انگار اور عیش کوش بنا دے اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی عظیم شخصیت کی پیش کردہ دعوت ہے۔ اس کے برعکس جو دعوت ہمارے نفوس کو گرما دے، جو دعوت ہمارے اندر کشتیاں جلا ڈالنے کی روح پیدا کر دے، جو دعوت ہمیں بلندیوں پر چڑھنا سکھا دے اس کو لازماً عظیم کا خطاب ملے گا۔ ایسی دعوت جب اٹھتی ہے تو ادائیگی فرض اور احساس ذمہ داری کو لذیذ اور راحت بخش بنا دیتی ہے۔ راحت کوشی، عیش طلبی اور سہل انگاری کو گلدستۂ طاق نسیاں بنا دیتی ہے۔ کسی دعوت کا ایسا ہونا خود اس کے برحق ہونے کی بڑی نفسیاتی دلیل ہے جس سے کوئی بھی صاحبِ خرد انکار نہیں کر سکتا۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ خوشی بھی عظیم ہو گی۔ وہ اپنے ساتھ اپنی ہی نوعیت کی کچھ ایسی عظیم ذمہ داریاں بھی لائے گی جو عام طور پر گراں گذریں گی۔ وہ ہمیں ہماری موجودہ حالت سے بلند تر حالت میں لے جانے کے لئے پورا زور لگائے گی۔ اگر ہمارے اندر تغیر و تبدل کی استعداد اور صلاحیت ہو گی تو ہمارے نفوس روز افزوں نشو و ارتقاء قبول کریں گے۔ خواہ اس راہ میں کتنی ہی دشواریوں اور مشکلات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔

اگر ہمارے اندر استعداد اور صلاحیت نہ ہو گی تو ہم ان ساری طوالتوں سے جی چرائیں گے اور علیحدہ رہنے ہی میں سکون و راحت محسوس کریں گے۔ مگر یہ ایک

بیماری ہوگی جو ہماری ارتقائی صلاحیت ہم سے سلب کرلے گی۔

نفسیاتی دلیل کا پیمانہ یہ بتاتا ہے کہ یہ راستہ جاتا تو ہے نشاط و ارتقاء کی منزل تک مگر ہے بڑا خاردار اور دشوار گذار۔ اگر سہل انگاری کی بناء پر یہ راستہ چھوڑ دیا جائے تو منزل عظمت کا سراغ نہیں مل سکتا۔

اس نفسیاتی دلیل کے معیار پر حضرت صدیقؓ نے محمدیؐ دعوت کو جانچ پرکھ کر دیکھا اور اس کی گہرائی تک اتر گئے۔ آپ نے یہ بنیادی سوال سامنے رکھا کہ محمدؐ قابل تقلید و اتباع رہبر اور لائق گرویدگی ہیرو ہیں یا نہیں! اگر ہیں تو آپ کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا چاہیئے۔

آپ نے اس نظر سے دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ کر لیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائق اتباع اور تقلید رہنما اور گرویدگی کے قابل ہیرو ہیں۔ چنانچہ آپ ان کے متبع کامل اور عاشق و گرویدہ بن گئے۔ اگرچہ آپ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ خیر و نیکی کا یہ راستہ بڑا جانگداز و جانگسل ہے۔ شرف و مجد کی یہ گھاٹی سراسر کدو کاوش ہے۔ حق پرستی کی یہ وادی مسلسل صبر و جہاد ہے۔ اس احساس نے ان کو قرضداروں کا بار اٹھانے شکستہ حالوں کی دست گیری کرنے اور اپنا حق کھو کر دوسروں کا حق ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور یہی محرک تھا کہ جب اسلامی دعوت نے اپنا خوان یغما چنا تو اس مرد خود آگاہ و خودشناس نے پورے شوق و سرور سے اس میں شرکت فرمائی۔ اگر یہ بین شعور ہوتی تو اس سے سنبل کی روئیدگی ناممکن تھی۔

دعوت نے اس کے یقین و اذعان کو خوب پختہ کر دیا اور وہ اس راہ کا مومن قانت، ضرب المثل عاشق اور صدیق اکبر جیسے لقب کا مستحق بن گیا۔

اس کے نزدیک غیب کی باتوں کا یقین کر لینا اور معلوم و مشاہد حقائق کی تصدیق کرنا دونوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ اس کی نگاہ میں اصلی معیار کہنے والے کی شخصیت تھی نہ کہ وہ بات جو کہی جا رہی ہے۔

کچھ مسلمان حدیث اسراء سن کر مرتد ہو گئے۔ مگر آپ کے لئے یہ ایک معمولی بات تھی۔ آپ نے فرمایا "جب میں اس شخصیت کی سنائی ہوئی آسمانی باتوں پر ایمان لے آیا ہوں، تو کیا وجہ ہے کہ آپ کی بتائی ہوئی دوسری باتوں کو صحیح نہ سمجھوں"۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمانوں سے مشورہ طلب کیا گیا۔ کچھ لوگوں نے صلح کی حمایت کی اور کچھ لوگوں نے مخالفت۔ یہاں دو قسم کی منطق سامنے آئی۔ عمر بن خطاب رضؓ کا کہنا تھا کہ "ہم حق پر ہیں۔ ہم دب کر کیوں معاملہ کریں؟"

اس کے برخلاف ابو بکر رضؓ کا کہنا یہ تھا کہ "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ خدا کے رسول ہیں۔ آپ نے جو کچھ پسند فرمایا۔ میں اس میں آپ کا اتباع فرض سمجھتا ہوں"۔

لوگوں نے لشکر اسامہ کے سلسلے میں اختلاف کیا۔ حضرت ابو بکر رضؓ کے سامنے متعدد تجاویز رکھی گئیں۔ ایک تجویز یہ تھی کہ لشکر کو مدینہ کی حفاظت کے پیش نظر یہیں رکھا جائے۔ ایک تجویز یہ تھی کہ اس کو مرتدین کی سرکوبی پر مامور کیا جائے۔

ایک تجویز یہ تھی کہ اس کو ایرانی سرحدوں پر بھیج دیا جائے تاکہ ادھر سے جو خدشہ ہے اس کا تدارک ہو سکے۔ ایک تجویز یہ تھی کہ اس کو اسی مہم پر روانہ کیا جائے جس پر روانہ فرمانے کا آنحضورؐ نے ارادہ فرمایا تھا۔ کچھ لوگوں کی رائے یہ تھی کہ اب حالات بدل چکے ہیں اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادوں پر نظر ثانی کر لی جائے یہ ساری تجاویز ایک طرف تھیں مگر حضرت ابو بکرؓ اسی تجویز کے زبردست حامی اور مؤید تھے جو آنحضورؐ کے منشاء سے ہم آہنگ تھی اور بالآخر اسی تجویز نے جامۂ عمل بھی پہنا۔

عطیات و وظائف کی تقسیم کا مسئلہ سامنے آیا۔ اس وقت دو طریقہائے عمل ممکن العمل تھے۔ ایک یہ کہ اجتہاد سے کام لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریقہ اختیار کیا تھا وہی اختیار کیا جائے۔

حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ "جن لوگوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوش بدوش جانیں نثار کیں، وہ ان لوگوں کے مقابلہ میں عطیات و وظائف کے زیادہ حقدار ہیں، جو آپؐ سے آخر وقت تک جنگ کرتے رہے اور مجبوراً ایمان لائے۔"

حضرت ابو بکرؓ کی رائے یہ تھی کہ "ہم لوگوں کو ان کے ایمان کی اجرت دینے پر مامور نہیں کئے گئے۔"

ان دونوں دلیلوں کو غور سے دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی رائے اجتہاد و تصرف پر مبنی تھی اور حضرت ابو بکرؓ کی رائے اتباع کامل کی

مظہر۔

ہیرو شپ کی گرویدگی نے حضرت ابوبکرؓ کے اندر جو اور بہت سے اوصاف و خصوصیات پیدا کر دی تھیں، اُن میں ایک خصوصیت اور وصف یہ بھی تھا کہ وہ مرتبہ و مقام کے آداب کو ہر وقت ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔

لشکر اسامہ کی روانگی کے وقت جب آپ نے حضرت عمرؓ کو اپنے پاس روکنا چاہا تو امیر المومنین ہونے کی حیثیت سے یہ فرمان نہیں جاری کر دیا کہ میری مرضی یہ ہے کہ عمرؓ ہمارے پاس رہیں بلکہ باقاعدہ امیر جیش حضرت اسامہؓ سے اس کی اجازت طلب کی۔

لشکر اسامہ جب روانہ ہونے لگا تو اس کو باقاعدہ رخصت کرنے کے لئے شہر کے باہر تک پیدل تشریف لے گئے۔ حضرت اسامہؓ نے احتراماً بار بار اپنے گھوڑے سے اتر جانے کی کوشش کی مگر آپ نے ان کو اترنے نہ دیا۔

اسی ادب شناسی کی وجہ سے آپ اپنی صاحبزادی حضرت عائشہؓ کو ام المومنین کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ ان تمام واقعات سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ صرف اپنے ہیرو کے گرویدہ ہی نہیں تھے بلکہ اس گرویدگی کے تقاضے کے مطابق ادب شناس بھی تھے اور اس بات سے پوری طرح باخبر تھے کہ درجات و مراتب کا کس قدر لحاظ رکھنا چاہئے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب ملک کے مختلف حصّوں سے وفود آنحضورؐ کی خدمت

میں حاضر ہوتے تو حضرت ابو بکرؓ ہی ان کو سلام و کلام کا طریقہ سکھاتے تھے۔

آنحضورؐ ایک روز مسجد کے اندر صحابہ کے حلقہ میں تشریف فرما تھے۔ اسی اثنا میں حضرت علیؓ تشریف لائے اور سلام کرنے کے بعد مجلس کے کنارے کھڑے ہو کر نشست ڈھونڈنے لگے۔ آنحضورؐ کے رُخ انور سے لوگوں نے محسوس کیا کہ آپ اس انتظار میں ہیں کہ کوئی شخص حضرت علیؓ کو جگہ دے دے۔ حضرت ابو بکرؓ آنحضورؐ کے داہنی طرف بیٹھے تھے فوراً اپنی جگہ سے ذرا کھسک گئے اور کہا کہ اے ابوالحسن یہاں تشریف لائیے۔

آنحضورؐ کا چہرۂ مبارک دمک اٹھا۔ آپؐ نے فرمایا "اے ابو بکر! اہل فضل کا فضل اصحابِ فضل ہی پہچانتے ہیں۔"

بڑی شخصیتوں سے جن لوگوں کو وابستگی، عقیدت اور گرویدگی ہوتی ہے وہ ان کے راز دار بھی ہوتے ہیں۔ یہ اوصاف حضرت صدیقؓ میں جس قدر پائے جاتے تھے، کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتے ہیں۔ چنانچہ آپ آنحضورؐ کے نجی معاملات و حالات میں گہرے راز دار تھے۔

حضرت عمرؓ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ جب بیوہ ہو گئیں تو حضرت عمرؓ نے پہلے حضرت عثمانؓ سے اور پھر حضرت ابو بکرؓ سے نکاح کی خواہش ظاہر کی بالآخر وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حبالۂ عقد میں آئیں۔

اس واقعہ کو حضرت عمرؓ یوں بیان فرماتے ہیں: "میں نے اس سلسلہ میں حضرت

عثمانؓ سے بات چیت کی۔ انہوں نے کہا کہ میں اس مسئلہ پر چند دن سوچنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کر سکتا ہوں۔ پھر میں نے حضرت ابو بکرؓ سے بات چیت کی مگر وہ خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا۔ میں ان کے اس رویہ سے آزردہ خاطر ہو گیا۔

چند دنوں کے بعد آنحضورؐ نے پیغام نکاح بھیجا اور میں نے حفصہؓ کو آپؐ کے نکاح میں دے دینے کا شرف حاصل کیا۔

اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ خاص طور پر مجھ سے ملے اور فرمایا کہ شاید آپ مجھ سے آزردہ خاطر ہو گئے تھے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا، میرے جواب نہ دینے کا سبب یہ تھا کہ آنحضورؐ کی مرضی کا پتہ مجھے پہلے ہی چل چکا تھا۔ میں نے یہ نہیں پسند کیا کہ آنحضورؐ کا راز ظاہر ہو جائے۔ اگر حضورؐ شادی کا ارادہ ترک فرما دیتے تو مجھے شادی کرنے میں کلام نہ ہوتا۔ اس طرح کی رازداری وہی شخص کر سکتا ہے جو حقیقی معنوں میں کسی کا گرویدہ ہو۔

اس رازداری کے ساتھ ساتھ حضرت ابو بکرؓ کلام کی باریکیوں اور نکتوں کو سمجھنے کا بھی غیر معمولی ملکہ رکھتے تھے۔ اور یہ وصف بالعموم انہیں لوگوں میں پایا جاتا ہے جو اعاظم رجال کو خطاب کرنا جانتے ہوں۔

آپ نے ایک آدمی سے جو کپڑا اٹھائے جا رہا تھا پوچھا، کیا تم کپڑا فروخت کر رہے ہو؟"

اُس نے جواب دیا "نہیں! خدا آپ کو معاف کرے۔"

آپ نے فرمایا "یوں نہ کہو بلکہ یوں کہو کہ نہیں اور خدا آپ کو معاف کرے۔"
یہ وہ نفس تھا جس پر وقار و تمکنت پر تو فگن تھی۔ جو عشق و گرویدگی اور تعظیم
و توقیر کا بہترین امتزاج تھا جس کے اعضاء و جوارح تک انہیں اعلیٰ و ارفع اوصاف
کے مظہر کامل تھے۔ جس کا ظاہر و باطن یکساں تھا۔ جس کے اعمال اور زندگی کے
دوسرے معاملات انہیں خصوصیات کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے بلکہ یوں کہنا
چاہیئے کہ اس قلب سلیم کی بے قراریاں اور بے تابیاں بھی انہیں اوصاف کی غماز
تھیں۔

یہ ہے اس شخصیت کا راز جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس شخصیت اور دوسری
شخصیتوں کے درمیان کیا فرق و امتیاز ہے۔

حضرت عمر بن خطابؓ کو آنحضورؐ سے جو گرویدگی اور عشق تھا اس سے انکار نہیں
لیکن اگر باریک بینی سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کا یہ وصف کلیدی یا بنیادی
حیثیت نہیں رکھتا تھا کہ اسی ایک محور کے ارد گرد ان کے دوسرے اوصاف گھومتے
ہوں۔ وہ اپنے ہیرو کے حد درجہ گرویدہ ضرور تھے مگر کلیدی طاقت اس وصف کو
نہیں بلکہ کسی اور وصف کو حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آنحضورؐ کے ہر ارشاد کو سنتے
تو تھے بڑے وقار اور تعظیم سے مگر آپؐ سے بحث و مباحثہ کر لینے میں بھی کوئی مضائقہ
نہیں سمجھتے تھے۔

اس کے برعکس حضرت ابو بکرؓ کے جس وصف کے ہاتھ میں کلیدی طاقت

وہ عشق اور گرویدگی تھی۔

حضرت عمرؓ اپنے استادؓ اور ہادی کے بعد مجتہد اوّل تھے اور حضرت ابوبکرؓ کو اس کے متبع اوّل ہونے کا شرف حاصل تھا۔

یہ دونوں ہمدم اپنی اپنی جگہ علیحدہ شخصیت اور متقابل خصوصیات کے مالک تھے۔ اور اس طرح کے متقابل کردار رکھنے والے افراد ہر تحریک کے دور میں — خاص طور پر ابتدائی دور میں — ضرور پائے جاتے ہیں۔

دو کردار

اخلاق و عادات اور مختلف دوسری انسانی صلاحیتیں اور قوتیں رکھنے والے

دو متقابل کردار ہر مذہب و ملت میں پائے جاتے ہیں۔

خصوصیت کے ساتھ ان تحریکوں میں ایسے کرداروں کا پایا جانا ناگزیر ہوتا ہے

جو اپنے اندر انسانی صلاحیتوں اور قوتوں کو ابھارنے کی غیر معمولی اور بے پناہ اسپرٹ

رکھتے ہیں۔

تاریخ کے صفحات ان متوازی اوصاف سے بھرے پڑے ہیں۔ تاریخ میں جہاں

معرفت کی باتیں ملتی ہیں وہاں پہلو بہ پہلو حکمت کے تذکرے بھی ملتے ہیں۔ جہاں

سیاست کا ذکر آتا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ قانون سازی اور دستور سازی کی

تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ انسانی زندگی کا ہر شعبۂ فکر و عمل دو متقابل و متجانس خصوصیات

کا حامل ہوتا ہے۔

ناقدینِ معرفت و حکمت، معرفت و حکمت کے دو متوازی کرداروں کو

بالترتیب افلاطون اور ارسطو کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ان کی اصطلاح میں اول الذکر کردار افلاطونی یا نظریاتی و مابعد الطبیعیاتی کے نام سے موسوم ہے اور موخر الذکر ارسطاطالیسی یا تجرباتی و مشاہداتی کے نام سے معروف ہے۔

یہی تقابلی خصوصیت ادب و فن کی دنیا میں بھی پائی جاتی ہے۔ خیال پرست ادیب، خیالی عشاق تخلیق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور واقعیت پرست ادیب اپنے کردار کو حقیقت پرستی کے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔

سیاست بھی ان دو گونہ کرداروں سے خالی نہیں۔ اس کوچہ میں جہاں ایسے لوگ نظر آتے ہیں جو سیاست کے تحفظ و بقاء کے لئے زندگیاں کھپا دیتے ہیں وہاں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو اس کی تجدید و احیاء کے لئے عمر بھر جد و جہد کرتے رہتے ہیں۔

ایسی ہی مثالیں قانون کی دنیا میں بھی ملتی ہیں۔ ایک گروہ اگر قانون کے ظاہری پہلو کو زیادہ اہمیت دیتا ہے تو دوسرا ایسا گروہ بھی موجود ہوتا ہے جو اس کی معنوی افادیت پر زیادہ زور دیتا ہے۔

دنیائے دین و مذہب کا بھی یہی حال ہے۔ دین کے ماننے والوں میں کچھ کثر قسم کے مقتدی اور مقلد ہوتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اول درجہ کے مجتہد اور صائب الرائے ہوتے ہیں۔

لوگوں کے رجحانات و میلانات کا جائزہ لیا جائے تو یہاں بھی اس قسم کے لوگوں کی کثرت ملے گی۔ کچھ لوگ جذبات پرست ہوتے ہیں، کچھ عقلیت کی طرف

مائل ہوتے ہیں، کچھ اغراض کے بندے ہوتے ہیں اور کچھ ایثار کا مجسمہ ہوتے ہیں۔

دو متقابل و متوازی کرداروں کے ذکر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ایک دوسرے سے متضاد ہوتے ہیں۔ اگر ایک سراپا صواب ہوتا ہے تو دوسرا غلطی کا پتلا ہوتا ہے اگر ایک خیر ہوتا ہے تو دوسرا شر ہوتا ہے۔ اگر ایک علم و عرفان کا مجسمہ ہوتا ہے، تو دوسرا سراسر جہل ہوتا ہے۔ ایک ہدایت کل ہوتا ہے اور دوسرا ضلالت محض ہوتا ہے۔ ہماری گفتگو کا ہرگز یہ منشاء نہیں۔ بلکہ دو متقابل کرداروں سے مراد یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا تتمہ ہوتا ہے۔ ایک کردار چند خوبیوں کا مالک ہوتا ہے اور دوسرا چند دوسری خوبیوں سے آراستہ ہوتا ہے۔ اس طرح افادیت دو چند ہو جاتی ہے اور دونوں قومی زندگی کے لئے پرند کے دونوں بازوؤں کا کام دیتے ہیں۔

اجتماعی زندگی میں ان دونوں کرداروں کا تعلق چولی دامن کا سا ہوتا ہے جہاں ایک کا ذکر آئے گا، دوسرے کی تصویر خود بخود سامنے آجائے گی۔ ایسے کرداروں کی جلوہ سامانیاں ان اقوام کے اندر ضرور نظر آتی ہیں جو میدان زندگی میں ارتقاء اور حیات اجتماعی میں غلبہ حاصل کرنے کے لئے انگڑائی لے رہی ہوں یا ترقی کے زینہ پر گام زن تو ہو چکی ہوں مگر دور ارتقاء کے ختم ہونے سے پہلے ہی ان کا امام اوّل ان کے درمیان سے رخصت ہو چکا ہو۔ ایسے وقت میں فطرتاً یہ ضرورت پیش آتی ہے کہ قوتیں مجتمع ہو کر ترقی کا باقی ماندہ میدان بھی طے کریں۔

مہدیؑ دعوت کی سب سے بڑی اور نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس نے اس قسم کے متوازی کردار ہر آن پیدا کئے جس کی بدولت یہ اُمت بنیانِ مرصوص بن گئی۔

اس اُمت کے بطن سے شجاعت و بہادری کے اعلیٰ کردار بھی پیدا ہوئے، سیاست و جہانبانی کے بے مثال مدبرین نے بھی جنم لیا، غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک بھی وجود پذیر ہوئے اور خیال آرائیاں کرنے والے بھی منصۂ شہود پر آئے الغرض ہر قسم کے متوازی اور اعلیٰ کردار کثرت سے پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی خوبیوں سے دوسروں کے نقائص کی تکمیل کی۔

ان اعلیٰ درجہ کے کرداروں کے اندر دو کردار ایسے بھی تھے جو اپنے بحرِ بے کراں کی گہرائیوں میں تقریباً تمام ہی قسم کے عادات و اخلاق، قوتیں اور صلاحیتیں میلانات و رجحانات اور دیگر انسانی خصوصیات سمیٹے ہوئے تھے۔ اور انہیں دونوں عظیم کرداروں کے قلزم میں وقت کے دوسرے اعلیٰ درجہ کے کردار بھی ندیوں اور نالوں کی طرح آکر گرتے تھے۔

یہ دونوں عظیم کردار صدیقؓ اور فاروقؓ ہیں۔ ان دونوں عظیم شخصیتوں کے درمیان مختلف پہلوؤں سے موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ موازنہ اور تقابل معاندانہ نہیں بلکہ دوستانہ زور آزمائی کی نوعیت کا ہے۔ زیادہ موزوں الفاظ میں یہ دونوں ایک ہی نظامِ شمسی کے دو سیارے تھے جو جذب و انجذاب کے وصف سے متصف ہونے کے باوجود اپنی مرکزیت نہیں چھوڑتے۔

ان دونوں کرداروں کے درمیان تقابل و موازنہ کرتے وقت جتنی گوناگوں صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں، وہ تعداد و شمار سے باہر ہیں۔

البتہ ان کو سمیٹ کر دو جامع الفاظ سے ضرور تعبیر کیا جا سکتا ہے اور وہ الفاظ ہیں اقتداء و اجتہاد۔

ابوبکرؓ اقتداء کا اعلیٰ کردار تھے اور عمرؓ اجتہاد کا لافانی کردار۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے اور آپ کی اطاعت میں ان دونوں حضرات کو یکساں مقام حاصل ہے۔ آپؐ کے نقش قدم پر چلنے کی خواہش اور تڑپ دونوں حضرات میں یکساں طور پر موجود تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کے عشق و محبت کی راہیں جدا جدا ہیں، اگرچہ ہیں متوازی اور ایک ہی سمت کو جانے والی۔

ان دونوں راہوں کے درمیان اتنا باریک اور ہلکا فرق ہے کہ مشکل ہی سے امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ اب ہم اس باریک فرق کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے اس فرق کی مختصر تعبیر تو یہ ہے کہ ایک جگہ موصوف کو مقدم اور صفت کو مؤخر کر دیجیے اور دوسری جگہ صفت کو مقدم اور موصوف کو مؤخر کر دیجیے یعنی یوں کہیے کہ

ابوبکرؓ کو ذاتِ محمدؐ سے پہلے عشق و گرویدگی تھی اور نبیؐ سے عشق و گرویدگی کا درجہ بعد میں تھا۔

عمرؓ کو نبیؐ سے پہلے عشق تھا اور محمدؐ کی محبت کا درجہ بعد کی چیز تھا۔

ذرا توضیح کے ساتھ یوں سمجھئے کہ ابوبکرؓ کو محمدؐ سے محمدؐ ہونے کی حیثیت سے

جو گرویدگی تھی اُس کا درجہ مقدم تھا۔ اور آپ کے نبیؐ ہونے کی حیثیت سے جو

محبت تھی اُس کا درجہ بعد میں تھا۔

عمرؓ نے پہلے نبیؐ کی نبوت کے متعلق اطمینان حاصل کیا اور یہ ایمان و اطمینان محرک

ثابت ہوا محمدؐ کی ذات سے عشق و گرویدگی کا۔

ابوبکرؓ نے محمدؐ کو اپنے ایک معتمد دوست کی حیثیت سے جانا پہچانا اور اسی

اعتماد کی بناء پر نبوت پر ایمان لائے۔

عمرؓ کو محمدؐ کی ذات سے کد اور دشمنی تھی مگر جب اس ذات کے بارے میں

اطمینان حاصل ہو گیا تو وہ مجبور ہو گئے کہ جس شخص سے نفرت کرتے تھے اس سے بے

پناہ محبت کریں۔ ابوبکرؓ قرآن کو محمدؐ کی اطاعت کیشی کے ذریعہ سمجھتے تھے اور عمرؓ

کی قرآن فہمی کا طریقہ یہ تھا کہ جب قرآن کی کوئی آیت سامنے آتی تو وہ آنحضورؐ سے

بحث و مباحثہ کرتے اور اطمینان حاصل کرتے۔

ان دونوں شخصیتوں کے درمیان یہ گہرا فرق ہونے کے باوجود دونوں ایک ہی

منزل کے رہرو ہیں۔

ابوبکرؓ اوّل درجہ کے مقتدی تھے

اور عمرؓ اوّل درجہ کے مجتہد۔

اولیت میں دونوں یکساں مقام کے مالک اور برابر سطح پر تھے۔ اب سنیئے کہ

کیسے یکساں مقام کے مالک اور کیسے ایک سطح پر تھے؟

ان دونوں عظیم شخصیتوں کے درمیان تقابل وموازنہ کا مطلب جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے، یہ نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی ایک صلاحیتوں کے اعتبار سے طاقتور اور دوسرا کمزور تھا یا ایک شہ زور اور دوسرا عاجز و درماندہ تھا۔ کمزوری اور درماندگی بہرحال ایک منفی وصف ہے جس سے کسی عظیم کردار کے ظہور کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

ابوبکرؓ نے مرتدین سے جہاد کے وقت جس غیر معمولی سختی کا مظاہرہ کیا، اس پر منفی ہونے کا شبہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کا منبع ومصدر اقتدا واتباع ہی کی اسپرٹ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے نتائج عظیم ثابت ہوئے۔

بنا بریں پیش نظر موازنہ قوت وضعف اور طاقت و درماندگی کے درمیان نہیں ہے بلکہ اس کی نوعیت یہ ہے کہ ایک فعال اور عظیم طاقت کن محرکات کی وجہ سے فعال اور عظیم بنی اور اسی طرح دوسری فعال اور عظیم طاقت کو کن اسباب نے فعال اور عظیم بنایا۔

یہ ضروری نہیں کہ ہر مقتدی ہر مجتہد سے فروتر مقام رکھتا ہو۔ بہت سے مقتدی ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو اپنی فعالیت اور عظمت میں مجتہدوں سے فائق تر ہوں۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اقتدا واتباع سراپا خیر ہو اور اجتہاد سراپا شر۔ ایک محسوس مثال شاید اس حقیقت کو سمجھنے میں زیادہ ممد ثابت ہو۔ بجلی کے قمقموں کو لے لیجیے، ایک قمقمہ ایسا بھی ہوتا ہے جس کا مستقل اور علیحدہ سوئچ ہوتا ہے۔ دوسرا ایک قمقمہ

ایسا بھی ہو سکتا ہے جو کسی دوسرے قمقمے کے سوئچ کا تابع ہو اور جب یہ دوسرا جلے تو وہ روشن ہو۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ جو قمقمہ کسی دوسرے قمقمے کا تابع ہو وہ حجم اور روشنی میں بھی کم ہو۔

یہ واضح مثال اقتداء اور اجتہاد کے بنیادی فرق کو سمجھنے کے لئے کافی ہے ظاہر ہے کہ یہ فرق قوت اور قوت کے درمیان اس کی مختلف نوعیتوں کے اعتبار سے ہے۔ قوت وضعف کا سوال یہاں خارج از بحث ہے۔

صدیقؓ اور فاروقؓ کے درمیان ایک اور پہلو سے بھی موازنہ کیا جا سکتا ہے اس کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اوصاف و عادات میں اس پہلو کو کافی دخل حاصل ہے۔ اس سے ہماری مراد جسمانی اور طبعی ساخت کا موازنہ ہے۔ جب ہم اس پہلو سے ان دونوں شخصیتوں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہاں بھی عجیب غریب قسم کا تقابلی پہلو سامنے آتا ہے۔

ہم ابوبکرؓ کو دیکھتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ وہ نحیف و ناتواں انسان کی قوتِ فکر و عمل کا مظہر اتم تھے۔

اور جب عمرؓ کو دیکھتے ہیں تو ایک لحیم و شحیم شخص نظر آتا ہے جو قوتِ عمل اور توانائی کردار کا نمونہ ہے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اوّل الذکر کے بال گنجان اور گھنے تھے اور آخر الذکر کا سر بالوں سے بالکل خالی۔

ہم اپنی کتاب "عبقریت عمر" میں بتا چکے ہیں کہ اٹلی کے مشہور عالم و مصنف لومبروزو اور اس کے ہم خیال علماء تجربہ اور موازنہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عبقریت کی چند واضح علامات ہوتی ہیں جن کا (عبقری) میں پایا جانا ضروری ہے۔ لیکن ان علامات کا یکساں ہونا ضروری نہیں۔ کچھ اشخاص کے اندر ایک طرح کی علامات پائی جاتی ہیں اور کچھ دوسروں کے اندر ان سے بالکل مختلف و متضاد دوسری نوع کی علامات پائی جاتی ہیں۔ لیکن ایسے افراد میں یہ بات ضرور مشترک ہوتی ہے کہ وہ اپنی ساخت کے اعتبار سے عام انسانوں سے حیرت انگیز طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ (عبقری) یا تو بہت زیادہ لمبا ہوگا یا بہت زیادہ پستہ قد۔ اپنے بائیں ہاتھ سے کام کرتا ہوگا یا دونوں ہاتھوں سے بیک وقت۔ اپنے گھنے اور گھونگھریالے بالوں کے سبب جاذب نظر ہوگا یا اتنا گنجا ہوگا کہ اس کا گنجاپن لوگوں کی انگشت نمائی کا موجب ہوگا۔ عبقری کے اندر احساس و شعور کی بھی فراوانی ہوتی ہے۔ حادثات کو خندہ پیشانی سے جھیل جانے کا زبردست ملکہ بھی اس کے اندر پایا جاتا ہے۔ بعض ایسے ہوتے ہیں جن کا پارہ بہت جلد چڑھ جاتا ہے۔ بعض اتنے سرد مزاج ہوتے ہیں کہ انتہائی اشتعال انگیز مواقع پر بھی ان کے دل و دماغ معمول کے مطابق کام کرتے رہتے ہیں۔ عام طور پر پردۂ غیب اور مخفی اسرار کی تلاش و تفحص کے گرویدہ ہوتے ہیں۔ یہ گرویدگی کبھی فراست کی صورت میں نمودار ہوتی ہے کبھی دوربینی و دوراندیشی کا روپ دھار کر سامنے آتی ہے کبھی شعور و احساس اور سوز و گداز کے رنگ میں ظاہر ہوتی ہے اور

کبھی دینی حمیت و جوش اور خشوع الی اللہ کے لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

عبقریت کی یہ مجمل خصوصیات اور امتیازات ہیں جن کا ملخص ہم نے نومبروزڈ

اور اس کے ہم خیال علماء سے اخذ کر کے پیش کیا۔

گویا مشیت کو یہ منظور تھا کہ ان دونوں دوستوں کی (عبقریت) اپنے جوہر میں تو

یکساں اور ہم رنگ ہو مگر تفصیلات و جزئیات میں ایک دوسرے سے اس قدر

مختلف ہو کہ اگر ایک کے سر پر گنجان اور گھنے بال ہوں، تو دوسرا بالکل گنجا ہو۔

صدیق رض اور فاروق رض کی ظاہری و باطنی ساخت کا مطالعہ کرنے سے یہ پتہ چلتا

ہے کہ اس کا گہرا اثر ان حضرات کے اخلاق و عادات اور زندگی کی جد و جہد کے دوسرے

شعبوں پر بھی پڑا تھا۔

عمر رض جسمانی توانائی اور جلال و ہیبت کے مالک تھے اور یہی چیز ان کو ہمیشہ

متنبہ کرتی رہتی تھی کہ ان کو نرم مزاجی اور بردباری کا شیوہ اختیار کرنا چاہیئے۔ یہی

احساس ان کی طبعی ساخت کے سرکش گھوڑے کو قابو میں رکھتا تھا۔

ابوبکر رض نحیف و ناتواں تھے اور اس چیز نے ان کے اندر یہ احساس پیدا کر دیا

تھا کہ اُن کو غصہ اور برافروختگی سے بچنا چاہیئے۔ اسی احساس نے اُن کو حلیم اور

بردبار بنا دیا تھا۔

یہ فرق توانائی و ناتوانی یا قوت و کمزوری کا فرق نہ تھا بلکہ دو برابر کی توانائیوں

کا فرق تھا جن کی نوعیتیں مختلف تھیں۔

اگر ابو بکرؓ کے اندر کمزوری یا ضعف کا شائبہ پایا جاتا تو وہ بھی کمزوروں کی طرح مغلوب الغضب ہو کر رہ جاتے اور اپنے عزم و ارادہ پر قابو نہ پا سکتے اگرچہ اس طرح شخصیت برباد ہو جاتی۔

اگر ان کے اندر احساس کہتری کا شائبہ پایا جاتا تو وہ اس احساس کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتے اور وقار و وضعداری اور دوسری قائدانہ خصوصیات سے متصف ہونا تو درکنار ان سے یکسر محروم رہ جاتے اور اتنے ہی پر اکتفا کرتے جس سے زیادہ کمزور کا حصہ نہیں۔

ان کو اپنی قوت ارادی پر پورا اعتماد تھا اور وہ اس راز سے اچھی طرح واقف تھے کہ نفس کو سدھا کر جسمانی ناتوانی کی تلافی کی جا سکتی ہے۔

ان دونوں حضرات کی زندگی میں ایک ایسا نازک موقع بھی آتا ہے جس میں انسان کا سب کچھ کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ نفسیاتی تجربات بتاتے ہیں کہ انسان ایسے موقع کا ایک سے زیادہ مرتبہ متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہ موقع آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کا ہے۔

ان دونوں ہمدموں کے دوسرے دوستوں میں کوئی بھی ایسا شخص نہ تھا، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی گرویدگی میں ان سے اونچا مقام رکھتا ہو۔ ان دونوں بزرگوں کے تصور میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ نبیؐ کی وفات جیسی جانکاہ خبر سنی جائے گی اور آپؐ کی صحبت سے محرومی کا اندوہ اٹھانا پڑے گا۔ یہ گھڑی انتہائی ہوشربا

اور اپنی نوعیت کی واحد تھی۔ اس بلائے بے ہنگام اور مصیبت کبریٰ کا سامنا کرنے کے بعد انسان کی پنہاں خوبی و ناخوبی کا ابل پڑنا ناگزیر تھا۔

یہ خبر ملتے ہی حضرت عمرؓ کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ اور وہ اپنے قہار غضب سے مغلوب ہو کر موت کی خبر لانے والوں یا اس خبر پر یقین کرنے والوں کی گردن اڑا دینے کی شدید دھمکی تک دے گذرتے ہیں۔

قوت و توانائی اور محبت و جوش سے لبریز یہ انسان ایسا نظر آتا ہے کہ اپنے غیظ و غضب کی قوت پر قابو پانے کی صلاحیت کھو چکا ہے اور اس کو نتائج و عواقب کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اس کے نفس پر یہ احساس مسلط ہو چکا ہے کہ موت اس کے اس دوست کی طرف ہاتھ اٹھانے کی جرات نہیں کر سکتی جس کا وہ اس قدر عاشق و گرویدہ ہے۔ جس کی وہ اتنی زیادہ تعظیم و توقیر کرتا ہے اور جس سے اس کو اس درجہ والہانہ عقیدت اور وابستگی ہے گویا وہ موت سے بھی اس بات کا خواہش مند ہے کہ وہ اس کے دوست کے معاملہ میں پہلو تہی کر جائے گی اور اس کے معاملہ میں ایسی مخصوص رعایت سے کام لے گی جو کسی زندہ مخلوق کا حق نہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کو بھی محمدؐ سے اتنی ہی عقیدت و محبت تھی جتنی حضرت عمرؓ کو۔ آپ کو بھی اپنے دوست کے فراق کا اتنا ہی غم و حزن اور قلق تھا جتنا حضرت عمرؓ کو۔ اور آپ بھی اپنے اس دوست کو تمام نوع انسانی میں اتنا ہی افضل و

برتر سمجھتے تھے جتنا حضرت عمرؓ۔ لیکن آپ نے اپنے نفس کو رام کر لیا تھا اپنی طبیعت کی تیزی و تندی کو پانی کر لیا تھا اور ایسے صبر آزما موقع پر بھی صبر کرنا سیکھ لیا تھا۔ اس صبر و ثبات کے اظہار کا یہی سب سے زیادہ موزوں اور مناسب موقع تھا۔ چنانچہ وہ اس کا مظاہرہ پوری شان کے ساتھ کر گئے۔

یہ طوفان زائل ہو جانے کے بعد دونوں حضرات اپنے اپنے اصل لباس میں ظاہر ہوئے۔ عمرؓ اس طرح سامنے آئے جس سے معلوم ہو گیا کہ وہ سراپا ہیجان و طغیانی ہی نہ تھے بلکہ تدبر و دور اندیشی کے بھی مالک ہیں۔ یہ کہ یہ خصوصیات اپنے وقت پر کام آنے کے لئے محفوظ و مخصوص تھیں۔ ابوبکرؓ لوگوں کے سامنے اس طرح آئے جس سے ثابت ہو گیا کہ آپ سراپا فکر و تدبر ہی نہیں بلکہ آپ کے اندر عشق و محبت اور گرویدگی کا اتنا قوی داعیہ موجود ہے جو انسان کو کچھ دیر کے لئے عواقب سے بے پروا کر دیتا ہے۔

لوگ ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مصروف ہوتے ہیں کہ ٹھیک اسی وقت انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر نئے خلیفہ کے انتخاب کے مسئلہ پر غور و خوض کرنے لگتے ہیں۔ وہاں عام رجحان یہ ہوتا ہے کہ خلیفہ مہاجرین میں سے نہیں بلکہ انصار میں سے ہونا چاہیے۔

حضرت عمرؓ کو اس صورت حال کی اطلاع مل جاتی ہے اور وہ اس فتنہ کو سر اٹھانے سے پہلے کچل دینے کی فکر میں پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ آپ بغیر کسی تاخیر کے حضرت

ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر سقیفہ پہنچتے ہیں۔

آپ کو ابوبکرؓ کی تند مزاجی کا خوف لگا رہتا ہے کہ وہ مجمع میں کہیں ایسی بات نہ کہہ گذریں جس سے حالات بننے کی بجائے نازک صورت اختیار کر لیں۔ چنانچہ وہ اس صورت حال سے نپٹنے کے لئے پوری تیاری کر کے جاتے ہیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ بیعت کے مسئلہ پر آپ نے ہر شخص سے پہلے غور و خوض کر لیا تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے اس سلسلہ میں وہ کچھ لوگوں سے مشاورت بھی کر چکے تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ آپ کے غضب کی حالت وقتی تھی جس پر بہت جلد قابو پا کر پھر حالتِ اعتدال پر آ گئے۔

ان دونوں حضرات کے اندر وافر فکر و تدبر بھی تھا اور غیظ و غضب بھی۔ کہیں تدبر پہلے ظاہر ہو جاتا اور کہیں غیظ و غضب کا ظہور پہلے ہوتا۔

یہی دونوں متقابل پہلو ہمیں ان ہستیوں کے مزاج اور زندگی کے ہر اس مسئلہ میں نظر آتے ہیں جس میں انہوں نے دو راستے یا دو علیحدہ راہیں اختیار کیں مثال کے طور پر ارتداد کا مسئلہ، خالد بن ولید کا مسئلہ اور عطیات و وظائف کا مسئلہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان مسائل میں سے ہر ایک مسئلہ میں ان دونوں حضرات نے اپنے مزاج اور طبیعت کے مطابق ہی روش اختیار کی یا دوسرے لفظوں میں وہی کچھ کیا جو ان کی عادات و اطوار سے عین متوقع تھا۔ اس سے ان حضرات کے خلوص اور حق پرستی کے پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جو مسئلہ یا

معاملہ جس اعتناء و توجہ کا مستحق تھا وہ اس پر اتنی ہی توجہ صرف کرتے تھے۔

ارتداد کے مسئلہ میں حضرت ابوبکرؓ سختی پر مائل نظر آتے ہیں اور حضرت عمرؓ نرمی پر۔ حالانکہ بظاہر یہ چیز ان دونوں حضرات کے مزاج کے برعکس تھی لیکن ذرا غور سے کام لیا جائے تو یہ عقدہ فوراً حل ہو جاتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ زکوٰۃ کی مد میں آنے والی ایک رسی تک چھوڑنے کے روادار نہ ہوئے۔ یہ چیز آپ کے مزاج کے منافی نہیں تھی۔ آپ کا مزاج ہر چیز برداشت کر سکتا تھا۔ مگر استخفافِ دین کے وقت کوئی طاقت آپ کو بڑھنے سے نہ روک سکتی تھی وقار اور سنجیدگی آپ کی زندگی کا طرۂ امتیاز تھا اور یہی چیز آپ کی شخصیت کی محافظ تھی۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے اگر اس مسئلہ میں اجتہاد سے کام لیا تو آپ کا یہ رویہ بھی آپ کے مزاج کے عین مطابق تھا۔

خالد بن ولیدؓ کے معاملہ میں سوال یہ تھا کہ ان کا محاسبہ کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ یہاں بھی دونوں ساتھیوں کا جواب ان کے اپنے مزاج و طبیعت کے مطابق ظاہر ہوا۔ یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ جو فیصلے انہوں نے دیئے، اس کے علاوہ کچھ اور فیصلے دیتے۔

حضرت خالدؓ پر الزام یہ تھا کہ انہوں نے مالک بن نویرہ کو قتل کر کے اس کی بیوی کے ساتھ چند دن جنگ ہی میں مجامعت کی ہے۔ ان کا یہ فعل جاہلی رسوم

اور اسلامی اخلاق دونوں ہی کے منافی تھا۔ اس لئے فطرتاً یہ سوال اٹھا کہ ان سے محاسبہ کیا جانا چاہیے یا نہیں؟

حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ ذرا سی بھی رُو رعایت کے بغیر محاسبہ کیا جانا چاہیے اس لئے کہ محاسبہ کے معاملہ میں عاقبت اور انجام کی پرواہ کرنا فاروقی مزاج کے خلاف تھا۔

لیکن حضرت ابو بکرؓ نے اس معاملہ کو اپنے مقتدی مزاج کے حوالہ کر دیا، جہاں سے یہی مشورہ ملا کہ محاسبہ یا تو نظر انداز کر دینا چاہیے یا کم از کم کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دینا چاہیے۔

حضرت ابو بکرؓ کا مزاج یہ گوارا کرنے کے لئے تیار نہ تھا کہ جس قائد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود منصب قیادت پر مامور کیا ہو اور جو خدا کی تلوار کا لقب حاصل کر چکا ہو اُس سے ایک لغزش سرزد ہو جانے کی بناء پر محاسبہ کیا جائے۔

عطیات و وظائف کے مسئلہ میں حضرت ابو بکرؓ کا موقف یہ تھا کہ اسلامی خدمات عطیات کی تقسیم کا کوئی معقول معیار نہیں۔ اور حضرت عمرؓ کا موقف یہ تھا کہ اس معاملہ میں خدمات کا ضرور خیال کرنا چاہیئے۔

مؤلفۃ القلوب کا مسئلہ جب سامنے آیا تو حضرت ابو بکرؓ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی تقلید کرتے ہوئے ان کو عطیات دیئے۔ لیکن حضرت عمرؓ ان کو کچھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ کیونکہ اُن کی رائے کے مطابق یہ لوگ یہ عطیات

اس لئے دیتے تھے کہ اسلام کمزور تھا۔ اب جب کہ اسلام طاقتور ہے اور وہ اسلام کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تو عطیات کا جواز ختم ہو گیا۔

اسی طرح جب ہم ان دونوں حضرات کے دیگر اختلافی رویوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہم کو یہاں بھی یہی نظر آتا ہے کہ یہ اختلاف دو قوتوں کے درمیان اپنی نوعیت کے اعتبار سے تھا۔

یہ مسلم امر ہے کہ قوت کی مختلف قسمیں اور عظمت کی متعدد انواع ہوا کرتی ہیں۔ نرم انسان ضروری نہیں کہ ہمیشہ نرمی ہی کا مظاہرہ کرے۔ اور سخت مزاج انسان کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہر حال میں سخت ہی ہو۔ اس بنا پر ایک عظیم انسان کا دوسرے عظیم انسان سے مختلف نوعیت کا ہونا انوکھی بات نہیں بلکہ ایک عظیم انسان کا ایک ہی عمل مختلف اوقات میں مختلف پیرایوں میں ہونا بھی اچنبھے کی بات نہیں۔

محمدیؐ دعوت کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ اس نے قوت و توانائی کا عرق نچوڑ کر یکجا کر دیا۔ اس نے قربانی کرنے والے اور خیر کی راہ میں پیش قدمی کرنے والے عناصر کو ایک محور پر سمیٹ دیا۔ اس نے انسانیت کے بہترین جوہر کو پکارا اور صدیقؓ و فاروقؓ جیسے اعاظم رجال اس کی آواز کی طرف کشاں کشاں چلے آئے اور بعد میں جزیرہ نمائے عرب کے عظیم کردار کہلائے۔

اسلام

بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ سب سے پہلے نعمتِ اسلام سے مشرف ہوئے اور متفق علیہ روایات میں ملتا ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابو بکرؓ، عورتوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ، بچوں میں سب سے پہلے حضرت علیؓ اور غلاموں میں سب سے پہلے حضرت زید بن حارثہؓ اسلام لائے۔ آخر الذکر کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متبنیٰ بنا لیا تھا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "میں نے جس کسی کو اسلام کی دعوت دی اُس نے شروع شروع میں یا تو کبر و غرور کا مظاہرہ کیا یا سوچ اور تردد میں پڑ گیا۔ مگر ابو بکرؓ کا رویہ مختلف رہا۔ میں نے جب اُن کے سامنے اسلام پیش کیا تو اُن سے کسی قسم کا تردد یا گریز ظاہر نہیں ہوا۔"

حضرت ابو بکرؓ نے اتنی آسانی سے اسلام کیوں قبول کر لیا؟

اس سوال کے صحیح جواب تک پہنچنے کا شاید مختصر راستہ یہ ہو گا کہ ہم قبولِ

اسلام کی راہ میں پیش آنے والی دشواریوں اور موانع کا جائزہ لے لیں نیز یہ دیکھ لیں کہ اس کی طرف بڑھنے کے کیا کچھ اسباب و محرکات موجود تھے۔

کیونکہ اگر دشواریاں سرے سے موجود ہی نہ ہوتیں یا موجود تو ہوتیں مگر نا قابل لحاظ اور نا قابل اعتناء، تو ایسی صورت میں یہ کہا جا سکتا تھا کہ راستہ دشوار گذار نہ تھا۔ بلکہ موانع کے بالکلیہ موجود نہ ہونے کی صورت میں تو کسی تردد یا پس و پیش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آئیے! اب اس سوال پر غور کریجیے کہ حضرت ابو بکرؓ کے قبول اسلام کی راہ میں وہ کون سی دشواریاں اور موانع پیش آ سکتے تھے جو ان کو آگے بڑھنے سے روک سکتے۔ بلکہ اس سوال کو پھیلا کر یوں کہہ لیجئے کہ وہ کون سی دشواریاں یا موانع ایسے ہیں جو کسی بھی انسان کو کسی نئی دعوت یا نئے عقیدے کی طرف مائل ہونے سے روک سکتے ہیں۔

اس نوع کی مختلف اور متعدد دشواریاں عام طور پر پیش آتی ہیں۔ مگر یہ ایک قابلِ لحاظ حقیقت ہے کہ یہ دشواریاں حضرت ابو بکرؓ کی راہ میں قطعاً حائل نہ ہو سکیں۔ ان موانع نے طویل عرصے تک دوسروں کی راہ کو روکے رکھا مگر اس رجل صادق و مصدق نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر اس طرح لبیک کہا گویا پہلے سے آپس میں کوئی معاہدہ ہو چکا ہو۔

نئے دین یا نئے عقیدے کی طرف مائل ہونے سے، مختلف اسباب ہیں جو انسان

کو روکتے ہیں کبھی انسان ان تمام اسباب کا بیک وقت شکار ہو جاتا ہے، کبھی ان میں سے چند اسباب راستہ روک دیتے ہیں اور کبھی ایک ہی سبب مانع بن جاتا ہے۔ کبھی کبر و غرور دیوار بن کر حائل ہو جاتا ہے، کبھی سیادت و قیادت کا عشق آگے بڑھنے نہیں دیتا۔ کبھی جمود اور ایک ہی حالت پر باقی رہنے کی خواہش مخالفت پر آمادہ کر دیتی ہے، کبھی کند ذہنی اور بلادت فکر و نظر کی راہیں مسدود کر دیتی ہے کبھی اعتدال سے بڑھی ہوئی ہوا پرستی سیدھے راستہ پر چلنے نہیں دیتی، کبھی موروثی مذہبی تعصب بصیرت کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا ہے۔ کبھی اقتدار اور طاقت کی سرمستی دیوانگی کا سبب بن جاتی ہے کبھی بزدلی اور نامردی طعن و تشنیع کے خوف سے روایات سے چمٹے رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ کبھی بڑھاپا ہر نئی چیز سے نفرت کا سبب بن جاتا ہے، کبھی کم سنی بڑے بوڑھوں کی تقلید و اتباع کا دامن نہیں چھوڑنے دیتی۔ کبھی باد نما فطرت "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کا "زریں" اصول اپنا کر وہی رُخ اختیار کرتی ہے جدھر طاقت و اقتدار اور سطوت و جبروت ہو۔

- کبر و غرور کا نشہ انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ کوئی نئی بات سن کر نہ کسی نئی دعوت پر کان نہ دھرے اور کسی انسان کے پیچھے چلنے میں اپنی ہتک محسوس کرے۔
- ہوس سیادت انھیں آگے نہیں بڑھنے دیتی کہ اس کو تجدید سے نفرت

دعداوت ہوتی ہے۔ اس کو یہ اندیشہ کھائے جاتا ہے کہ اگر نئی قیادت فروغ پا گئی اور اس نے قدیم نظام کو پیوند زمین کر کے اس کی جگہ اپنا نیا قصر تعمیر کر لیا تو ہمارا کیا بنے گا؟

● جمود اور ایک ہی حالت پر باقی رہنے کی خواہش انسان کو اس لئے مخالفت پر آمادہ کر دیتی ہے کہ وہ اپنی ذاتی منفعت اور غرض کو ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتا ہے اور کسی قیمت پر اس بات کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ اپنے ذاتی مقاصد کی ادنیٰ قربانی بھی دے سکے۔ یہ ذہنیت نئی دعوت کے کسی بھی بہتر پہلو پر غور و فکر کرنے کی نوبت ہی نہیں آنے دیتی۔

● کند ذہنی اور کودنی نام ہی اس بات کا ہے کہ جو بات بھی کہی جائے اس کو سوچنے سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے۔ جو چیز معلوم نہ ہو اس سے دشمنی کی جائے جو چیز مزاج کے خلاف ہو اس سے نفرت کی جائے۔

● ہوا پرستی جب حد اعتدال سے گذر جائے تو اس کی طلب میں کمی ہونے کی بجائے دن بدن اور اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ نئی دعوت چونکہ اصلاح و تجدید کی علمبردار ہوتی ہے اور عیش و عشرت کے محلات و قصور کو منہدم کر دینا اس کے بنیادی مقاصد میں داخل ہوتا ہے۔ اس لئے عیش پرست اور عشرت پسند طبقہ دعوت کی زندگی میں اپنی موت تصور کرتا ہے اور یہی چیز بنائے مخاصمت بن جاتی ہے۔

مذہبی تعصب عقیدے کے بارے میں بڑے نازک جذبات رکھتا ہے۔ اپنے

روایتی عقیدے پر جہاں آنچ آتے دیکھی اندھا بہرا ہو گیا۔ اس کی نگاہ میں عقیدہ ایسی آبائی میراث ہوتا ہے جس کی حفاظت ہر حال میں فرض ہے۔ جب یہ حالت ہو جائے تو عقل و فہم سے کام لینا تو در کنار، انسان ایسی باتوں پر اصرار کرنے لگتا ہے جن سے اس کو نفرت ہونی چاہیئے تھی۔ اور وہ یہ سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ وہ جس عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے وہ فرسودہ ہو چکا ہے۔

- بزدلی اور نامردی انسان کا دامن پکڑ کر کہتی ہے کہ آگے نہ بڑھنا۔ یہ نئی دعوت جو کچھ پیش کر رہی ہے اس کا راستہ خطرات سے گھرا ہوا ہے۔ مصلحت اور دانشمندی کا تقاضا ہے کہ چپ سادھ کر بیٹھے رہو۔
- بڑھاپے کے متعلق اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ ہر نئی چیز کا دشمن ہوتا ہے کم سنی اور نو عمری ایک طرف تو عیش محض ہوتی ہے اور تمرد و طغیان کی راہ پر بڑی آسانی سے ڈال دیتی ہے، دوسری طرف سرتاپا اطاعت شعاری اور بڑے بوڑھوں کے پیچھے اندھا دھند چل پڑنا اس کا فطری خاصا ہوتا ہے۔
- زمانہ سازی انسان کا قبلہ اس سمت متعین کرتی ہے جدھر طاقت و اقتدار ہو۔ ظاہر ہے کہ نئی دعوت یا نئے دین کی طرف ایسے شخص کا بڑھنا ناممکن ہے

یہ وہ موانع ہیں جو عام طور پر ایک انسان کو کسی نئی دعوت کی طرف بڑھنے سے روکتے ہیں۔ مگر یہ ایک قابلِ لحاظ حقیقت ہے کہ ابو بکرؓ کی راہ میں یہ موانع قطعاً حائل نہ ہو سکے جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ میں کبر و غرور کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ اس کے برعکس تواضع اور خاکساری میں مشہور تھے۔ اپنی قوم میں محبت اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ لوگوں میں "محبب اور نرم مزاج" کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ قوم کے لوگ آپ کے پاس بڑی بے تکلفی سے آتے جاتے اور آپ کے علم و تجربہ اور حسن معاشرت سے استفادہ کرنے میں لطف و راحت محسوس کرتے۔

آپ ہوس سیادت سے بھی پاک تھے۔ اور لوگوں کی گردنوں پر زبردستی مسلط ہو جانے کا جذبہ بھی آپ کے اندر نام کو نہ تھا۔ آپ کا شمار قریش کے شرفاء اور اہل وجاہت میں ضرور ہوتا تھا مگر آپ کا تعلق ان قریش قبائل سے نہ تھا جن کی امریت اور مطلق العنانی کا سکہ چل رہا تھا۔ بلکہ آپ خاندان تیم سے تھے جو قریش کا ایک بہت مختصر اور قلیل التعداد قبیلہ تھا۔ اس کی قلتِ تعداد کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ کی بیعت خلافت ہوئی تو ابو سفیان نے حضرت علیؓ کے پاس آکر آپ کو حضرت ابوبکرؓ کے خلاف برانگیختہ کرنے کے لئے کہا کہ خلافت اس قبیلہ میں کیوں چلی گئی جو قریش میں سب سے زیادہ ذلیل اور قلیل التعداد ہے؟

ابوسفیان نے یہ بات محض جذبہ منافرت کے تحت کہی تھی۔ ورنہ قبیلہ تیم اتنا حقیر اور قلیل التعداد نہ تھا، جتنا ابوسفیان نے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے زیادہ سے زیادہ اس قبیلہ کے متعلق جو بات کہی جا سکتی ہے وہ صرف یہ کہ سیادت کے

میدان میں اس کو اتنی قوی پوزیشن حاصل نہ تھی کہ وہ لوگوں کے دل و دماغ پر چھا جاتا۔

جاہلی نظام کے باقی رہنے سے بھی حضرت ابوبکرؓ کو کوئی دلچسپی یا غرض نہ تھی۔ آپ اس دور میں بھی قرضہ جات اور دیات کے ضامن ہوا کرتے تھے اس لئے جاہلیت کے رہنے یا مٹ جانے سے آپ کی کسی ذاتی منفعت کا سوال خارج از بحث تھا۔ تجارت آپ کا ذاتی پیشہ تھا مگر نئی دعوت اس کی مخالف نہیں تھی۔ بلکہ دعوت دینے والا خود تجارت پیشہ تھا اور دوسروں کو بھی اس پیشہ کی ترغیب دلاتا رہتا تھا۔

آپ کند ذہن یا کودن بھی نہ تھے۔ بلکہ اس کے برعکس فہم و تدبر اور ذکاوت و فراست میں نمایاں شہرت رکھتے تھے۔ اشارات و کنایات میں بات کی تہہ تک پہنچ جانا آپ کا مخصوص وصف تھا۔ اس کا مشاہدہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگوؤں اور وعظ و نصیحت کے دوران بارہا کیا گیا۔

ہوا پرستی کا عفریت بھی کبھی آپ کے قریب نہ پھٹکا تھا۔ آپ ہوا پرستی کی ان جملہ اصناف کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے جو اس دور میں اہل عرب کے یہاں رائج تھیں۔ کبھی شراب و شاہد کو ہاتھ نہ لگایا۔ کبھی کسی معیوب بات کا داغ دامن کو لگنے نہ دیا۔ اور جب جاہلیت کو چھوڑ کر اسلام اختیار کیا تو بدکرداری کا الزام لگانے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔

جہاں تک مذہبی تعصب اور تنگ نظری کا تعلق ہے، وہ اس دور میں کچھ زیادہ طاقتور نہ تھی۔ بت پرستی جو عربوں کا مذہب تھا اس کی گرفت ڈھیلی ہو چکی تھی۔ کچھ لوگ اس عقیدے کو چھوڑ کر بالکل لامذہب ہو چکے تھے۔ کچھ لوگ ترقی یافتہ عقائد کی تلاش و جستجو میں سرگرداں تھے۔ کچھ لوگ یہودیت اور عیسائیت قبول کر رہے تھے۔ یہ تمام گروہ آزادی کے ساتھ یہ سب کچھ کرتے اور ان کو کسی قابل ذکر دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ بنا بریں حضرت ابو بکرؓ جاہلیت کے رسوم و رواج اور عبادات کے بارے میں نہ کسی تعصب کا شکار ہو سکتے تھے اور نہ ہوئے بلکہ اس کے برخلاف بتوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور ان کی پرستش کرنیوالوں پر حیرت کا اظہار کرتے۔ "انباد نجباد الابناد" میں خود آپ کی زبانی مذکور ہے کہ

"جب میں سن رشد کو پہنچ گیا، تو ابو قحافہ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک عبادت گاہ میں لے گئے اور کہا کہ یہ تمہارے بلند و برتر خدا ہیں۔ پھر مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ میں نے بت کے قریب جا کر کہا۔ میں بھوکا ہوں مجھے کھانا کھلا دو۔ کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے کہا۔ میں ننگا ہوں مجھے لباس عطا کر دو۔ کوئی جواب نہ ملا۔ اس پر میں نے غصے میں آ کر بت کے منہ پر پتھر دے مارا اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔"

آپ بزدل بھی نہ تھے بلکہ کم درجہ کا بہادر کہنا بھی آپ کے شایان شان نہیں۔ آپ کا شمار ان معدودے چند بہادروں میں ہوتا تھا جن کی بہادری اور شجاعت جاہلیت

اور اسلام دونوں ادوار میں زبانِ زد خاص و عام رہی۔ آپ آنحضورؐ کے ساتھ ہر اس جنگ میں ثابت قدم رہے جس میں چند جانباز سرفروشوں کے سوا کوئی ثابت قدم نہ رہ سکا۔ آپ نے مرتدین کے خلاف جنگ کرنے کا خطرہ مول لیا۔ غرض تاریخ میں آپ کے متعلق جو کچھ بھی مذکور ہے اس سارے ذخیرے میں کہیں یہ بات نہیں ملتی کہ آپ مال ومنال کے زیاں سے ایک لمحے کیلئے بھی ہراساں ہوئے ہوں۔

آپ اتنے بوڑھے بھی نہ تھے کہ ہر پرانی چیز کو حرزِ جاں بنائے رکھتے۔ نہ اتنے کم سن ہی تھے کہ عنفوانِ شباب کی تند آندھی آپ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی طرف متوجہ نہ ہونے دیتی۔ بلکہ پختہ عمر اور پختہ ذہن تھے۔ معاملات کو خود سمجھنے اور فیصلے کی قوت وصلاحیت سے مالا مال تھے۔

یہ وہ موانع تھے جو کسی انسان کو نئی اصلاحی دعوت قبول کرنے سے روکتے ہیں مگر یہ تمام موانع حضرت ابوبکرؓ کی راہ میں ناپید تھے اور راستہ بالکل ہموار تھا۔ ایک طرف تو یہ موانع آپ کی راہ میں کم سے کم تھے اور دوسری طرف آپ کے اندر کچھ ایسے محرکات وداعیات موجود تھے جو کسی صحیح عقیدہ سے قریب کرنے میں ہمیشہ ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں اور جو بات سنتے اور صحیح ہونے کی صورت میں اس کی اتباع کرنے کی تحریک کرتے رہتے ہیں۔ انہیں محرکات وداعیات نے آپ کے اندر یہ اسپرٹ پیدا کر دی کہ آپ جاہلیت اور اسلام کا فرق وامتیاز کر سکیں اور یہ دیکھیں کہ ان دونوں میں سے کون قابلِ ترک اور کون قابلِ اختیار

ہے۔

آپ صادق الطبع اور روشن ضمیر تھے۔ اس لئے حق واضح ہو جانے کے بعد اس کو اختیار کئے بغیر چارہ نہ رہا۔ اسلام لانے سے پہلے بھی صدیق کے لقب سے مشہور تھے۔ اس لئے کہ لوگ آپ کی صداقت پر اعتماد رکھتے تھے اور ان کو یہ یقین تھا کہ قرضوں اور دیتوں کے سلسلے میں آپ کی پیش کردہ ضمانتیں ضائع نہیں ہو سکتیں اور نہ وعدہ خلافی ہو سکتی ہے۔ صدیق کے لقب کی وجہ بعض لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ آپ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر معاملہ میں بے چون و چرا تصدیق کی۔ اس لقب کی وجہ تسمیہ میں یہ اختلاف ہونے کے باوجود اس بات میں ہر شخص کا اتفاق ہے کہ آپ کی پیش کردہ ضمانتیں جاہلیت کے دور میں سچی سمجھی جاتی تھیں اور آپ کے وعدوں پر پورا اعتماد کیا جاتا تھا۔

جس شخص کی فطرت میں صداقت اور سچائی اس طرح رچی بسی ہو، اس کو کوئی اور طاقت نئی اصلاحی دعوت قبول کرنے سے کیسے روک سکتی ہے۔ ایسا صداقت شعار انسان سچی اور سیدھی سادھی بات سن کر چین سے کیوں کر بیٹھ سکتا ہے۔ چہ جائے کہ وہ کبر و غرور میں مبتلا ہو کر اس سے دشمنی کرنے لگے یا متکبروں کی طرح اس کے خلاف محاذ بنا کر کھڑا ہو جائے۔

آپ کے اندر عقیدے کے معاملہ میں فطری جوش و ولولہ موجود تھا۔ آپ کسی نئے ترقی یافتہ عقیدے کی تلاش میں تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ کہیں

ایسے لوگ مل جائیں جو صحیح عقائد رکھتے ہوں۔ جب نیا عقیدہ ہاتھ آگیا، تو اپنی سوسائٹی قائم کرنے کے لئے بڑی تندہی اور جانفشانی سے کام شروع کر دیا چنانچہ آپ کے ہاتھوں منتخب روزگار صحابہ کی ایک معتد بہ تعداد اسلام میں داخل ہوئی اور عظمت و اخلاص کی غیر فانی یادگاریں چھوڑ گئی۔ مثلاً عثمان بن عفان عبدالرحمن بن عوف، زبیر بن عوام، سعد بن ابی وقاص اور طلحہ بن عبیداللہ۔ اس پر بھی چین نہ آیا جب تک اپنے گھر کا ماحول بھی بدل نہ ڈالا اور والدین واقارب کو بھی اس دین میں داخل نہ کر لیا۔

آپ کے دینی جوش و ولولہ کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس وقت مسلمانوں کی تعداد چالیس نفوس سے بھی کم تھی اور مشرکین ہر طرف سازشوں کا جال بچھائے بیٹھے تھے، اس وقت بھی آپ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ آپ مسلمانوں کو لے کر کھلے بندوں صحن کعبہ میں نماز پڑھائیں اور لوگوں کو علی الاعلان اسلام کی دعوت دیں۔ اسی جوش کے نتیجہ میں آپ کو ایک دفعہ اتنی شدید اذیت پہنچائی گئی کہ جاں بحق ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ مشرکین نے آپ کو زدوکوب کرنے کے بعد جس حالت میں چھوڑا تھا انہیں یقین ہو چکا تھا کہ یا تو آپ ختم ہو چکے ہوں گے یا عنقریب ایسا ہو جائے گا۔

آپ کے جوش و ولولہ کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ

آپ نے عین گذرگاہِ عام سے متصل اپنی مسجد بنائی تھی۔ جب کچھ پڑھتے یا تلاوتِ قرآن کرتے تو ہر گذرنے والا آسانی سے سنتا۔ مشرکین اس پر جزبز ہوتے اگر آپ باز نہ آتے۔ جس آدمی نے آپ کو پناہ دے رکھی تھی اُس نے ایک دن کہا کہ "اب صورتِ حال کچھ ایسی نازک ہوگئی کہ یا تو آپ چوری چھپے اپنی عبادات گذاریں، ورنہ پناہ کا جو پیمان میں نے کر رکھا تھا مجبوراً واپس لینا پڑے گا۔"

آپ نے بلا تردد پناہ واپس کر دی اور فرمایا "میرے لئے اللہ کی پناہ کافی ہے۔"

ب۔ جو انسان حق بات سننے اور ماننے کی اتنی گہری صلاحیت رکھتا ہو اور پھر اس حق کی طرف دعوت دینے کے لیئے اس قدر بے قرار ہو، کوئی وجہ اور کوئی سبب نہیں کہ وہ نبیٔ اصلاحی دعوت کو اس والہانہ جذبے اور عشق کے ساتھ نہ اپنا لے۔

ج۔ اسی جذبہ و شوق نے آپ کو اس دینی معرفت و شعور سے قریب تر کر دیا تھا جو غیبی مکاشفات، رویائے صادقہ اور الہامی اشارات سمجھنے کا خوگر بنا دیتا ہے۔ آپ کے متعلق مروی ہے کہ بعثتِ نبویؐ سے قبل سفرِ شام میں آپ نے ایک خواب دیکھا جس میں یہ بشارت تھی کہ عنقریب ملکِ عرب میں نبوت کا ظہور ہوگا۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ آپ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھ کر خوابوں کی تعبیر فرمایا کرتے۔ بعض اوقات خوابوں کی تعبیر و تفسیر کی

اجازت طلب کرتے اور خود اپنے خوابوں کو بھی بہت اہمیت دیا کرتے۔

ایمان بالغیب کے اس وصف اور جذبہ نے آپ کو لطیف الاحساس، سراپا خشوع و خضوع اور رقتِ و نرمی کا مجسمہ بنا دیا تھا۔ آپ کے قلب میں اس سختی کا شائبہ تک موجود نہ تھا جو ذہنوں کا دروازہ کھلا ہونے کے باوجود دلوں کا دروازہ بند ہی رکھتی ہے۔ خشوع و خضوع کی حالت میں رقت طاری ہو جاتی اور فرطِ مسرت سے بھی آنکھیں نم آلود ہو جاتیں۔ غرض دینی رجحان ہر لحاظ سے اتنا کامل تھا کہ ادھر بتی دکھائی اور روشن ہو گیا۔

صداقت شعاری، دینی جوش و ولولہ اور الہامی و مکاشفاتی اوصاف سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ آپ اعلیٰ درجہ کے خوش بیان و خوش نوا خطیب، صاحب فصیح و بلیغ، سخن شناس و سخن سنج، شعر و شاعری کی اداؤں سے گہرا شغف رکھنے والے اور کلام کے بانکپن اور ندرت کے زبردست دانا تھے۔ راز بھی تھے۔ نبوت کے دعویداروں کی ہفوات سن کر آپ کا ذوق فوراً مجروح ہو جاتا۔ آپ نے مسیلمہ کذاب کے قرآن کے چند فقرے سنے اور اس کے پڑھنے والوں کی کور ذوقی و بد مذاقی پر ماتم کرتے ہوئے فرمایا۔

"تمہارا برا ہو! اس کلام میں آخر کون سی خوبی یا حسن ہے؟"

اسی اعلیٰ ذوق کی بدولت آپ نے قرآن کریم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بلاغت بالغہ کو اس کی گہرائیوں تک اتر کر سمجھا۔

یہ سارے اسباب و محرکات اپنی جگہ مسلّم، ان سے کسی کو انکار نہیں، مگر سب سے بڑا اور اہم سبب جس نے آپ کو محمدیؐ دعوت قبول کرنے میں مدد دی وہ وہی ہے جس کا ذکر ہم پہلے کہیں کر چکے ہیں۔ یعنی آپ کی گرویدگی اور عشق رسولؐ اس جذبہ کو ہم آپ کے اخلاق کی خشتِ اوّل اور آپ کی شخصیت کی کلید سمجھتے ہیں۔

ہیرو شپ سے محبت و گرویدگی رکھنے والا شخص اپنے ہیرو کی قدر و منزلت سے واقف ہوتا اور اس کی ذات پر کامل اعتماد کرتا ہے۔ اور یہ اعتماد ارتقاء کی اس بلندی پر پہنچ جاتا ہے جس کا تصوّر عام ذہن نہیں کر سکتا۔ یہ اعتماد اپنی جگہ خود ایک مضبوط چٹان کی طرح ٹھوس ہوتا ہے۔ اور یہ اعتماد جس وقت براہین و بینات کا تعاون حاصل کر لیتا ہے تو اس کی عظمت دوچند ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اعتماد اس وقت بھی متزلزل نہیں ہوتا جب لوگ شکوک و شبہات کے تندریلوں کے سامنے ڈگمگا جاتے ہیں۔

کتبِ تاریخ میں ایک سے زیادہ ایسی روایات ملتی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دعوت سے بہت عرصہ پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے مابین گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ ثقہ مورخین کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکرؓ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر شام کے وقت آپ کے ہمراہ تھے۔ اس سفر میں آپ کی بحیرہ راہب سے ملاقات ہوئی۔ اس نے دین کے متعلق بہت سی

باتیں بتائیں اور نبوت کی پیشین گوئی بھی کی۔ بعض یورپین مورخ اس بات کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ دعوت سے بہت پہلے ان دونوں دوستوں کے مابین گہرے تعلقات رہے ہوں گے۔ مگر ایک ایسی دلیل ہمارے سامنے موجود ہے جس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے تاریخی ثبوت کی ضرورت نہیں۔

وہ یہ کہ حضرت ابوبکرؓ باتفاق رائے ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے اوّل اوّل دعوت کو قبول کیا۔ ایسا ہونا ممکن نہ ہوتا اگر دونوں دوستوں کے درمیان سابقہ طویل ربط و ملاقات نہ ہوتی۔ یہ سبقت و اوّلیت خود یہ ثبوت فراہم کرتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ طویل عرصہ تک ایک دوسرے کے محرم راز رہے ہوں گے حضرت ابوبکرؓ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار و اوصاف سے پوری طرح روشناس رہے ہوں گے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کے اوصاف و کردار کو جانتے رہے ہوں گے۔ اور جب حضرت ابوبکرؓ کے کان میں دعوت کی آواز پڑی ہوگی، تو پیش کرنے والے کی سیرت و کردار اور بلاغت کلام سے متاثر ہو کر دعوت قبول کر لی ہوگی۔

پھر چونکہ وہ بے مثال ماہر انساب بھی تھے اور اہل قریش کی اخلاقی خوبیوں و کمزوریوں سے بھی پوری واقفیت رکھتے تھے۔ اس لئے جس وقت آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکیزہ حسب و نسب اور مضبوط سیرت و کردار کا موازنہ آپ کے مخالفین کی کمزوریوں اور آلائشوں سے کیا ہوگا تو دعوت کی حقانیت کا یقین اور

زیادہ مستحکم و پائیدار ہو گیا ہو گا۔

پہلے ہم جو کچھ بیان کر چکے ہیں اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو گئی کہ حضرت صدیقؓ نے بڑی آسانی سے دعوت قبول کر لی۔ اس ضمن میں ہم دو اہم وجوہات بھی بیان کر چکے ہیں۔

اوّل یہ کہ آپ کی راہ میں موانع کم سے کم حائل ہوئے۔

دوم یہ کہ ایسے قوی محرکات موجود تھے جو آپ کو بڑی سہولت سے دعوت کی طرف کھینچ لے گئے۔

ان سارے اسباب و عوامل نے ایسا شاہکار سامنے لا کھڑا کیا جو تحریکوں کی تاریخ میں کچھ انوکھا نظر آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک ایسا انسان ہمارے سامنے کھڑا نظر آتا ہے جس کو آبائی دین سے مختلف ایک نئے دین کی دعوت دی گئی اور اس نے ایک لمحہ تردد اور پس و پیش کئے بغیر دعوت سنتے ہی قبول کر لی۔ پھر اس کے لئے یک سو ہو گیا اور صاحب دعوت کے بعد اس دعوت کا سب سے بڑا مبلغ بھی بن گیا۔

اس انوکھی مثال کو سمجھنا اس بات پر منحصر ہے کہ ان احوال و ظروف اور ماحول کو کسی دوسرے دور کے احوال و ظروف اور ماحول پر قیاس نہ کیا جائے اور اس فرق کو ملحوظ رکھا جائے جو ایک دور اور دوسرے دور میں فطری طور پر ہوا کرتا ہے

جب ہم حضرت ابو بکرؓ کے متعلق سنتے ہیں کہ انہوں نے بلا تامل دنا خیر محمدیؐ دعوت قبول کرلی تو یہ بات ہمیں بڑی انوکھی اور عجیب و غریب نظر آتی ہے اور عقل آسانی سے یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ذہن میں موجودہ دور کا ماحول ہوتا ہے۔ جس کے لئے کسی مسلمان یا عیسائی یا یہودی کا اس طرح تبدیلِ دین کر لینا واقعی حیرت زا ہے۔

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ حضرت ابو بکر کا اسلام قبول کرنا اس نوعیت کا نہ تھا۔ اور نہ ہی ان کا سابقہ مذہب اس قسم کا تھا جس قسم کے دین و مذہب پر آج ایک مسلمان ایمان رکھتا ہے۔

مشرکین قریش کے دین میں نہ تو گہری روحانیت موجود تھی نہ اس کے عقائد دل و دماغ میں راسخ و پیوست تھے۔ نہ اس کو کامیاب زندگی یا حیاتِ اخروی سے کوئی ربط تھا نہ اسرارِ کائنات پر غور و فکر کی صلاحیت پیدا کرنے کی اس کے اندر اسپرٹ تھی۔ نہ اس کو اجتماعی زندگی کے صلاح و فساد سے کوئی واسطہ تھا نہ اس کو مرد و عورت کے باہمی تعلقات اور حقوق جیسے معاملات سے بحث تھی۔ نہ اس کے ماننے والے اس کو اس نظر سے دیکھتے تھے جس نظر سے آج ادیان و عقائد کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس دین کے پیروؤں کے عقائد کی حیثیت موروثی

رسوم و رواج سے زیادہ نہ تھی۔ یا پھر یہ ایسے عادات و اطوار کا مجموعہ تھے جن کی بنیاد عیش و عشرت اور سیادت و قیادت کے مفادات پر تھی۔ یہ لوگ یہ بات سننے کے روادار نہ تھے کہ ان کے آبا و اجداد اخروی زندگی میں نامراد اور خائب و خاسر ہوں گے۔ یا وہ جس دین پر مرے وہ گمراہیوں اور ضلالتوں کا مجموعہ تھا۔ دعوت کے خلاف ان کے اندر نفرت و بغاوت کے جو جذبات پائے جاتے تھے، ان کی مثال اُن جاہل دہقانوں کے جذبات سے ملتی جلتی تھی جو ایک آدمی کے خلاف محض اس لئے بھڑک اٹھتے ہیں کہ وہ خوشی اور غم کی تقریبات میں ان رسوم و رواج کی پابندی نہیں کرتا جن کے وہ عادی ہیں۔ اور جن کے ادا نہ کرنے سے ان کے خیال کے مطابق خاندانی ناک کٹ جاتی ہے۔ اور جن کے چھوڑ دینے سے ان پروہتوں اور مہنتوں کے مفاد و مصلحت کا بھی خون ہو جاتا جن کے ہاتھوں یہ رسوم انجام پاتے ہیں۔

مشرکین کو اس امر سے زیادہ سروکار نہ تھا کہ کوئی انسان اپنا دین چھوڑ کر کوئی دوسرا دین اختیار کر لے بشرطیکہ وہ اپنا معاملہ اپنی ہی حد تک محدود رکھے اور دوسروں پر اثر انداز نہ ہو۔ چنانچہ ان کے درمیان یہود و نصاریٰ بھی موجود تھے اور ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اپنا دین چھوڑ کر ان کا دین اختیار کر لیتے تھے یہ لوگ ایسے افراد سے کوئی قابل لحاظ دو کر تعرض نہ کرتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ کچھ دیر کے لئے بعض اعزہ و اقارب ناراض ہو جاتے۔ مگر یہ ناراضگی دیرپا نہ

ثابت ہوتی۔

اُن کے لئے اگر کوئی چیز ناقابل برداشت تھی تو وہ یہ کہ کوئی نیا دین یا دعوت اُن کے رسوم و رواج کو بدل دے اور ان کے اجتماعی اور معاشرتی اصول وضوابط کو منہدم کر دے۔

مشرکین میں جو لوگ محمدیؐ دعوت کے دشمن تھے، وہ عام طور پر تین قسم کے تھے۔

اوّل وہ لوگ جو سیادت و قیادت کے مناصب پر براجمان تھے۔ یہ لوگ سیادت کے روایتی اصول کی موت میں اپنی موت مضمر پاتے تھے۔

دوسرے وہ لوگ جو فکر و تدبر کی صلاحیت سے عاری تھے اور وہی کچھ کرنے کے عادی تھے جس کا اشارہ آقاؤں کی طرف سے ملے۔

تیسرے وہ لوگ جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تو رکھتے تھے مگر ان کو دعوت کو قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔

ان تینوں گروہوں کے علاوہ جتنے لوگ موجود تھے وہ دعوت سے بہت قریب تھے۔ ان کا رخ اس سمت ہو جانے کے بعد کوئی چیز آسانی سے ان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جاہلی رسوم و عادات پر فتح پا لینا معمولی کام یا نسبتاً آسان تھا۔ رسوم و رواج خواہ کسی دین و عقیدہ سے تعلق رکھتے ہوں ان پر غلبہ حاصل کرنا بازیچہ اطفال نہیں۔ بالخصوص اس وقت

جب کہ ان کے پیچھے کچھ لوگوں کی مصلحتیں، عوام کی جہالت و نادانی اور آبائی طرزِ بود و باش سے چمٹے رہنے کا جذبہ کام کر رہا ہو۔ ہمارے کہنے کا منشاء یہ تھا کہ ان تینوں طبقوں کے علاوہ جتنے لوگ تھے ان کے لئے دعوت کی طرف بڑھنے کے امکانات بہت زیادہ تھے۔

حضرت ابو بکرؓ کا تعلق ان تینوں طبقوں میں سے کسی ایک سے بھی نہ تھا پھر آپ اپنی روشن ضمیری کی بناء پر یہ اچھی طرح محسوس کرتے تھے کہ جاہلی عقائد انسانی روح کی تشنگی بجھانے کی قطعاً صلاحیت نہیں رکھتے۔

ایک اور مانع جو مشرکین کو دعوت سے نفرت دلانے کا عام طور پر سبب بن جایا کرتا تھا وہ یہ کہ ایک مشرک جو اپنے ماں باپ پر فخر کیا کرتا تھا، جب یہ سنتا تھا کہ میرے ماں باپ ضلالت کا شکار تھے اور آخرت میں نامراد ہوں گے تو اس کی رگِ حمیت پھڑک اٹھتی اور وہ دعوت سے بدظن و برافروختہ ہو جاتا مگر خدا نے حضرت ابو بکرؓ کی راہ میں یہ روڑا بھی نہ رہنے دیا تھا۔ جب دعوت نے جنم لیا اس وقت ماں باپ دونوں بقیدِ حیات تھے اور نجات کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ آخر آپ کی مسلسل جد و جہد سے والدین بھی مشرف باسلام ہو گئے اور دل کو اطمینان حاصل ہو گیا۔

یہ تھے حضرت ابو بکرؓ۔ آپ سے جب یہ کہا گیا ہو گا کہ غلط اور فاسد رسوم و رواج کو چھوڑ کر نئے دین کے بہتر اور ترقی یافتہ طرزِ زندگی کو اپنا لو، تو آپ کیوں

نہ ان فاسد رسوم و رواج کو چھوڑ کر نئے دین کا طرزِ زندگی اختیار فرما لیتے؟

آپ کو جاہلی رسوم و آداب سے کوئی محبت نہ تھی۔ آپ کبر و غرور، ذلت و پستی اور غباوت و کند ذہنی کے روگ سے بھی پاک تھے۔ فراواں عقل و فہم کے مالک تھے۔ خیر و صلاح کی محبت رگ و ریشہ میں خون کی طرح دوڑ رہی تھی۔ احساسات میں وفور اور روح و ضمیر میں زندگی موجود تھی۔ دعوت دینے والا بھی کریم و حلیم تھا۔ صادق و سادہ تھا۔ محبوب و ہر دلعزیز تھا۔ عیوب سے پاک تھا اور اس قابل تھا کہ اُس کی پیش کردہ دعوت پر آمنا و صدقنا کہا جاتے۔ دریں صورت حیرت و تعجب ہوتا اگر وہ اتنی جلدی آگے بڑھ کر گلے نہ لگا لیتے۔

یہ ہے وہ حقیقت جو حضرت ابوبکرؓ کے اسلام پر غور کرنے سے سامنے آتی ہے۔ اور یہی حقیقت ان تمام لوگوں کے اسلام پر چسپاں ہوتی ہے جو اوّل اوّل داخلِ اسلام ہوتے۔ اس حقیقت کا سراغ لگانے کے لئے ان خارقِ عادت قصے کہانیوں اور من گھڑت افسانوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں جو عام طور پر اس سلسلہ میں مشہور ہیں۔ اور ان غیر معتبر تاریخی روایات کی بھی حاجت نہیں جن میں سببِ اسلام، جنت کا وعدہ، دوزخ کی وعید اور کسی خوف و ڈر کو قرار دیا گیا ہے۔

ہم اپنی کتاب "عبقریت محمدؐ" میں بتا چکے ہیں کہ طاقتور لوگ کسی خوف کی وجہ سے اسلام میں داخل نہیں ہوتے۔ طاقتور لوگوں کو آخر کس چیز کا خوف د

اندیشہ لاحق ہو سکتا ہے؟ اسی طرح کمزور لوگ بھی کسی خوف و اندیشہ کے زیر اثر مشرف با سلام نہیں ہوئے۔ اس لئے کہ اسلام لانے کی وجہ سے وہ الٹے خود مشرکین کے جور و جفا کا نشانہ بن کر رہ گئے۔ اور جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا، اس وجہ سے نہیں کہ ان کے اندر زہد و تقوی یا شجاعت و بہادری کی فراوانی تھی۔ اسی طرح جن لوگوں نے اسلام کو اپنایا وہ اس وجہ سے نہیں کہ محض جنت کی لذتوں کے دلدادہ یا قوت و طاقت کا مقابلہ کرنے کے کس بل سے عاری تھے۔ بلکہ اس کی بنیاد پاکیزگی سیرت اور اصلاح امور کا جذبہ تلاش تھا، جو اس جذبے سے قریب تھا، خواہ وہ غریب ہو یا امیر، آقا ہو یا غلام، اسلام کی نعمت سے مالا مال ہوا۔

مگر جس کی فطرت میں کجی تھی اس نے انکار اور مخالفت کی روش اختیار کی یہی بنیادی حقیقت ہمارے سامنے یہ بات اجاگر کر کے رکھ دیتی ہے کہ جو لوگ اسلام کی سیف براں ذبراق کے ظاہر ہونے سے پہلے دین اسلام میں داخل ہوئے ان کا مقام و مرتبہ بعد میں اسلام لانے والوں سے بہت بلند و بالا ہے پس حضرت عمرؓ، ابو بکرؓ، عثمانؓ اور دوسرے اکابر و اعاظم کے متعلق یہ کہنا کہ وہ کسی لالچ یا خوف کی وجہ سے ایمان لائے اور مشرکین کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اپنی جرأت و بے باکی اور شجاعت و بہادری کی وجہ سے ایمان نہیں لائے اتنی ہی گھناؤنی اور مکروہ ہوا پرستی ہے جتنی گھناؤنی اور مکروہ ہوا پرستی میں خود یہ کفار

مبتلا تھے۔

حضرت صدیقؓ شرفائے عرب میں پہلے شخص تھے جنہوں نے نبیؐ کے بعد دین اسلام اختیار کیا۔ آپ نے بہت جلد آگے بڑھ کر نبیؐ کی دعوت پر لبیک کہا اور اس طریق سے کہا جو اس دعوت کے شایانِ شان تھا۔ گویا کاتبِ ازل نے اوّل روز ہی یہ لکھ دیا تھا کہ اگر نبیؐ دعوت کے اوّل شخص ہوں تو یہ آپ کے ثانی ہوں۔ چنانچہ حضرت صدیقؓ ہر مرحلہ میں ثانی رہے۔ اسلام لانے میں بھی ثانی، غار ہجرت میں بھی ثانی، بدر کے سائبان میں بھی ثانی اور ہر اس جنگ میں ثانی جو مسلمانوں اور مشرکوں کے مابین ہوئی۔ آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ اس وقت بھی دیا جب اسلام دورِ ابتلا میں تھا اور اس وقت بھی جب اسلام کا ستارہ عروج پر آچکا تھا۔ خفیہ طور پر بھی رفاقت کی اور علانیہ بھی۔

آپ نے پہلے ہی دن سے اپنی جان و مال اور آل و اولاد سب کچھ اسلام کے نام پر وقف کر دیا تھا۔ چنانچہ والدہ کو لے کر اس نازک وقت میں آنحضورؐ کے پاس آئے، جب خود موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ اور اس حالت میں آنحضورؐ سے درخواست کی کہ آپ والدہ کے سامنے دعوت پیش فرمائیں اور ان کے اسلام لانے کی بھی دعا کریں۔ والد کو فتح مکہ کے بعد آنحضورؐ کی خدمت میں لائے اور وہ اسلام سے مشرف ہوئے۔ اس وقت ان کا سر چاندی کی طرح سفید ہو چکا تھا۔ ہجرت کے وقت سارا مال و دولت ہمراہ لیتے

گئے اور دین کو آل و اولاد پر ترجیح دی۔

آپ تک دعوت کیسے پہنچی، اس سلسلے میں مختلف قسم کی روایات آئی ہیں بعض سے پتہ چلتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو خاص طور پر دعوت دی اور آپ نے قبول کر لی۔ بعض سے یہ پتہ چلتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کے اندر لوگوں کو دعوتِ عام دی۔ اس کی خبر حضرت صدیق رضؓ کو پہنچی۔ اس کے بعد آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا "اے ابوالقاسم! آپ کے متعلق جو خبر پہنچی ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟"

آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا، "تم تک میرے متعلق کیا بات پہنچی ہے؟" حضرت صدیق رضؓ نے عرض کیا، "مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے لوگوں کو توحید کی دعوت دی ہے اور اپنے رسولِ خدا ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔"

آپ نے ارشاد فرمایا، "یہ خبر صحیح ہے۔ میرے رب نے مجھے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ ابراہیمی دعوت سپرد فرمائی ہے اور مجھے تمام انسانوں کی طرف مبعوث فرمایا ہے۔"

حضرت صدیق رضؓ نے یہ سن کر کچھ پس و پیش نہ کیا اور فرمایا، "بخدا! میں نے کبھی آپ کے اندر کذب اور جھوٹ کا شائبہ نہیں پایا۔ بلاشبہ آپ منصبِ رسالت کے سزاوار ہیں، اس لئے کہ آپ بے مثال امین ہیں۔ قرابت کا پورا پاس و لحاظ رکھتے ہیں۔ بلند کردار و سیرت کے مالک ہیں۔ ہاتھ آگے بڑھائیے میں بیعت کرتا

ہوں۔"

صدق و امانت، صلہ رحمی اور حسن کردار جیسے اعلیٰ اوصاف کی عظمت سے حضرت صدیق رضؓ خوب آشنا تھے۔ آپ کو ان اوصاف سے عشق تھا اور خود بھی انہیں کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اس لئے جو شخص صادق و امین تھا۔ رحیم و حلیم اور بلند کردار تھا۔ اس شخصیت میں حضرت صدیق رضؓ کی عقلِ سلیم اور قلبِ عظیم کے لئے بڑا اپیل تھا۔ اور یہی اوصاف ہر صداقت پسند انسان کی نگاہ میں اہمیت کبریٰ رکھتے ہیں۔ خارق عادات واقعات ہمیں فریب میں مبتلا کر سکتے ہیں مگر ایک ایسا انسان دھوکہ نہیں دے سکتا جو صادق ہو۔ جو رحمت و رأفت کا پتلا ہو اور جو بلند کرداری اور اخلاق کا اعلیٰ نمونہ ہو۔

غرض اسی وقت سے اسلام حضرت ابو بکر رضؓ کی نگاہ میں ایسا دین نظر آنے لگا جس کی خاطر دنیا کی تمام منفعتیں اور مسرتیں قربان کی جا سکتی تھیں! اور جس کی راہ میں مال و منال اور آل و اولاد اور ہر محبوب و مرغوب چیز بھینٹ چڑھائی جا سکتی تھی۔ اگر آپ اسلام کو دنیا پرستانہ نقطہ نظر سے ناپتے تو وہ ایسا وبال نظر آتا جس کو اپنانے کی آرزو کوئی بھی صاحبِ عقل و خرد اپنے دل میں نہ پاتا۔ مگر حضرت صدیق رضؓ نے اسلام کو جس معیار پر پرکھ کر دیکھا وہ دنیا کا معیار نہیں بلکہ دین کا معیار تھا۔ اور اس پر جانچنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ آپ ہی کی تجارت حقیقی معنوں میں نفع بخش ہے اور آپ ہی کا راستہ ہر دوسرے راستہ سے سیدھا

اور مستقیم ہے۔

آپ اسلام کی منزل تک دین کے راستے سے پہنچے اور پھر اس راہ میں پیش آنے والی ہر آزمائش کے مقابلے میں صبر و ثبات کا پہاڑ بن کر کھڑے ہو گئے اور اس طرح کھڑے رہے کہ اگر اس مقام پر کوئی طالبِ دنیا ہوتا تو یقیناً بھاگ کھڑا ہوتا۔

حضرت صدیقؓ نے جس روز آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ کے اندر نماز باجماعت ادا کرنے کا مشورہ دیا مسلمانوں کی تعداد اس وقت چالیس نفوس سے متجاوز نہ تھی۔ پھر خود آگے بڑھ کر کعبہ کے عین بیچ لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف دعوت دی۔ مشرکین برافروختہ ہو کر مسلمانوں پر پل پڑے، زدو کوب کیا، اذیتیں پہنچائیں اور طرح طرح کے اہانت آمیز سلوک کئے۔ عتبہ بن ربیعہ خود حضرت صدیقؓ کے گرد ہو گیا اور اپنے جوتوں سے اس قدر مارا پیٹا کہ چہرے نے متورم ہو کر ناک تک کو ڈھک لیا۔

آپ کے قبیلہ بنو تیم کو واقعہ کی اطلاع ہوئی تو فوراً موقع پر پہنچ گئے اور آپ کو مشرکین کے نرغے سے نکال کر خون آلود کپڑوں میں گھر لے گئے۔ سب کو یقین ہو چکا تھا کہ آپ جانبر نہ ہو سکیں گے۔ اس بناء پر آپ کے قبیلے کے کسی فرد نے اس وقت کعبہ کے اندر چیخ کر کہا تھا کہ ابوبکر نہ بچے تو ہم عتبہ کو بھی جیتا نہ چھوڑیں گے۔ غرض گھر پہنچنے کے بعد یہ لوگ آپ کا احاطہ کئے اس وقت

تک بیٹھے رہے جب تک آپ کو افاقہ نہ ہو گیا)۔ ہوش میں آنے کے بعد اس درد وکرب کی حالت میں بھی سب سے پہلے جو بات آپ کی زبان سے سنی گئی وہ یہ کہ "رسول اللہ کس حال میں ہیں؟"

اس پر لوگوں نے ناراضگی کا اظہار کیا اور والدہ سے کہا کہ آپ کو کچھ کھلائیں پلائیں تاکہ ہوش ٹھکانے آجائیں۔ مگر آپ نے رسول اللہ کی حالت معلوم کرنے سے پہلے کھانے پینے سے انکار کر دیا۔

ماں نے کہا "میں تمہارے ساتھی کے متعلق کچھ نہیں جانتی!"

آپ نے فرمایا "بنتِ خطاب کے پاس جاکر معلوم کر آؤ"

والدہ جب حضرت حفصہؓ کے پاس گئیں تو حضرت حفصہؓ نے اُن کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا اور خیال کیا کہ شاید وہ مشرکین کی مخبری کے لیے آئی ہوئی ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ "مجھے ابوبکرؓ اور محمد بن عبداللہ کے بارے میں کوئی علم نہیں!"

ماں نے گذارش کی کہ آپ خود ہی ابوبکرؓ کے پاس چل کر ان کی تسلی کر دیں حضرت حفصہؓ تشریف لے گئیں اور حضرت صدیقؓ کو شدید درد وکرب کی حالت میں پایا۔ یہ حالت نہ دیکھی گئی اور فرمایا "جن لوگوں نے آپ کے ساتھ یہ ظلم کیا ہے ان کے فاسق و فاجر ہونے میں کوئی شک نہیں۔ مجھے یقین ہے خدا اُن سے ضرور انتقام لے گا!"

حضرت صدیقؓ نے وہی پرانا سوال حضرت حفصہؓ سے بھی کیا کہ "آنحضورؐ کس حال میں ہیں؟"

حضرت حفصہؓ نے ماں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "ان کی موجودگی میں؟"

آپ نے فرمایا "ان کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں"

حضرت حفصہؓ نے فرمایا "آپؐ صحیح و سلامت ہیں"

اس جواب سے بھی تسلی نہ ہوئی جب تک خود آنکھوں سے آنحضورؐ کا جلوہ نہ دیکھ لیا۔ چنانچہ مزید دریافت کیا کہ "حضورؐ کس مقام پر تشریف رکھتے ہیں؟"

حضرت حفصہؓ نے بتایا، ارقم بن ابی الارقم کے مکان میں"

آپ نے یہ سنتے ہی فوراً وہاں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ ماں نے اس ارادہ سے روکنا چاہا کہ بغیر کھائے پیئے یوں ہی باہر جانے اور چلنے پھرنے سے حالت اور نزار ہو جائے گی۔ مگر آپ نے قسم کھالی کہ جب تک رسول اللہؐ کو نہ دیکھ لوں کچھ نہ کھاؤں پیوں گا۔

دونوں خواتین انگشت بدنداں تھیں کہ اس شخص کو اپنے دوست اور نبیؐ سے اس درجہ گہرا عشق ہے! چنانچہ وہ اس کے مطالبے کے آگے جھک گئیں اور اس بے تاب و تواں جسم کو اپنے کندھوں کا سہارا دیتے ہوئے آنحضورؐ کی خدمت میں لے گئیں۔ وہاں پہنچتے ہی آپ رسول اللہؐ سے لپٹ گئے۔ اور رسول اللہ

کا دل بھی اس مخلص رفیق کو دیکھ کر بھر آیا۔ اس مخلص رفیق نے عرض کیا "میرے ماں باپ آپ پر نثار! مجھے کچھ زیادہ تکلیف نہیں۔ اس فاسق و فاجر نے محض میرا چہرہ کچھ زخمی کر دیا ہے۔ یہ میری ماں ہے جو اپنے والدین کا حق ادا کرتی رہی ہے اس کو آپ اللہ کی طرف دعوت دیجیے اور اس کے حق میں دعا فرمائیے کہ اللہ اس کو آپ کے طفیل آگ سے محفوظ رکھے۔")

مشرکین کی طرف سے جب بھی کوئی ایذا خود آپ کو پہنچائی گئی تو اس کو خوشی خوشی گوارا کر لیا۔ مگر جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی ایذا پہنچائی جاتی تو فوراً بے تاب ہو جاتے اور ظالموں کا ہاتھ پکڑ لیا کرتے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مشرکین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گریبان مبارک پکڑ کر گستاخیاں کر رہے تھے۔ آپ یہ دیکھ کر فوراً بے تاب ہو گئے اور ان کے اندر گھس کر کہا "تمہارا برا ہو! تم ایک انسان کو محض اس لئے قتل کر دینے پر تلے بیٹھے ہو کہ وہ اللہ کو اپنا رب مانتا ہے۔"

مشرکین آنحضورؐ کو چھوڑ کر آپ پر پل پڑے۔ جی بھر کر زد و کوب کیا۔ بال پکڑ کر گھسیٹا اور اس وقت چھوڑا جب آپ نڈھال ہو گئے۔

مشرکین کی ایذا رسانی سے تنگ آ کر جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو حبشہ ہجرت کر جانے کا حکم فرمایا تو آپ کے قبیلہ کے شرفا یہ خبر سن کر بڑے فکر مند ہوئے۔ ربیعہ بن فہیم جو ابن الدغنہ کے نام سے مشہور ہے

آپ کے پاس آیا اور کہا کہ " اے ابو بکر! آپ جیسے انسان کو ہرگز ملک بدر نہ ہونے دیا جائے گا۔ آپ مفلسوں کی مدد کرتے ہیں۔ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ دوسروں کے قرضوں کا بار اٹھاتے ہیں۔ حق بات میں لوگوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ میں آپ کو اپنی پناہ دیتا ہوں۔ آپ یہیں رہئے اور اپنے ہی شہر میں اپنے رب کی عبادت کیجئے۔"

پھر ابن الدغنہ نے شام کے وقت اکابر قریش کے گھروں کا طواف کیا اور ان کو مطلع کیا کہ اس نے حضرت ابو بکرؓ کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔

ان لوگوں نے کہا کہ " ان سے کہہ دو کہ اپنے گھر ہی میں اپنے رب کی عبادت کریں۔ جو جی میں آئے پڑھیں مگر علانیہ ایسا نہ کریں۔ کیونکہ ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ اس طرح ہماری عورتوں اور بچوں کو فتنہ میں مبتلا کر دیں گے۔

حضرت صدیقؓ نے اپنے گھر کے صحن میں مسجد بنا لی۔ اسی میں نماز ادا کرتے اور اسی میں تلاوتِ قرآن کرتے۔ عورتیں اور بچے آواز سن کر جمع ہو جاتے، کچھ تمسخر کرتے، کچھ اظہارِ تعجب کرتے اور پوچھتے کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ مشرکین یہ دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے اور ابن الدغنہ سے مطالبہ کیا کہ وہ حضرت ابو بکرؓ کو علانیہ نماز پڑھنے اور تلاوتِ قرآن سے باز رکھے۔ ورنہ اپنی دی ہوئی پناہ واپس لے لے۔ مگر حضرت ابو بکرؓ نے یہ بات نہیں مانی اور ابن الدغنہ سے کہا کہ " میں تمہاری دی ہوئی پناہ واپس کرتا ہوں۔ مجھے خدا کی پناہ زیادہ عزیز و محبوب ہے۔"

جب تک مکہ میں قیام رہا برابر اپنے دین اور اپنے نبیؐ کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ سرداروں اور شیوخ کے سامنے دعوت رکھی، قبائل کو اس کے مقاصد سمجھائے اور اس دفعہ میں اپنی ذات کے لیے صرف اتنا ہی کیا جو سد رمق کے لئے ضروری تھا۔ اس ساری تگ و تاز میں اگر کوئی سہارا تھا تو وہ اپنی سیرت کی پاکیزگی، طہارت اپنا وقار و سنجیدگی اور لوگوں کا حسن ظن اور اعتماد۔ یہ مثبت دلیل عقلی دلائل اور جدلی مناظروں اور مباحثوں سے ہر قدم پر زیادہ مؤثر ثابت ہوئی۔ اس دوران اذیتوں اور مظالم کا تختۂ مشق بھی بنے رہے مگر اس بات کی کبھی پروا نہ کی۔ اگر کوئی فکر دامن گیر ہوئی تو وہ صرف یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلم برادری مصائب و آلام سے محفوظ رہے۔ چنانچہ جو بھائی غریب تھے اُن کی دل کھول کر مدد کی۔ جو غلامی کی حالت میں تھے اور خدا کی راہ میں مصائب جھیل رہے تھے اُن کو آزادی دلائی جو مقروض تھے ان کے قرضے اتار دیے۔ جنہوں نے ہجرت کرنی چاہی ان کے لیے ہر ممکنہ سہولت فراہم کی۔ غرض جو بھی چھوٹا بڑا کام نئے دین اور اس کے پیروؤں کو فائدہ و سہولت پہنچا سکتا تھا ہر ایک میں آپ نے کوئی نہ کوئی پارٹ ضرور ادا کیا۔

پھر ہجرت مدینہ کا دور آیا۔ یہ ہجرت مسلمانوں کے لئے بڑی پُرخطر تھی کفار قریش ہر مہاجر کی گھات میں لگے ہوئے تھے اور اس کے پیچھے اپنے جاسوسوں کی کھیپ کی کھیپ چھوڑ رکھی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نقل و حرکت پر شدید

نگرانی تھی۔ غرض یہ کہ دشمنوں کے بس میں جتنی تدبیریں تھیں سب بروئے کار آچکی تھیں۔ ایسی نازک گھڑی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ہجرت کرنے کا مطلب یہ تھا کہ گویا انسان اپنی جان کی بازی لگا چکا ہے یا اس کو یہ یقین کامل ہے کہ نبیؐ اپنے رب کی مدد و تائید سے ضرور محفوظ رہے گا۔ پھر مزید یہ کہ ترکِ وطن اپنی جگہ خود بڑی چیز ہے۔ خاکِ وطن سے آخر کس کو الفت نہیں ہوتی؟

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جان جوکھوں ہجرت کا حکم فرمایا اور حضرت صدیقؓ نے اس حکم کو اس طرح سر آنکھوں پر رکھا گویا کوئی خطرہ درپیش نہیں ہے بلکہ سلامتی کی بشارت دی جارہی ہے

آپ کی چھوٹی صاحبزادی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ "اس سے پہلے میں نے کسی شخص کو فرطِ مسرت سے روتے نہیں دیکھا تھا۔ یہ واقعہ میں نے پہلی بار دیکھا کہ جب آنحضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو ہجرت کا حکم فرمایا تو آپ فرطِ مسرت سے رو پڑے"

بڑی صاحبزادی حضرت اسماءؓ فرماتی ہیں کہ "آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہجرت فرمائی تو آپ کے ہمراہ حضرت ابوبکرؓ نے بھی ہجرت کی اور اپنے ہمراہ گھر کی تمام دولت بھی لیتے گئے جو تقریباً پانچ ہزار درم کی مالیت کے برابر تھی۔ اس کے بعد ہمارے دادا ابو قحافہ ہمارے پاس آئے۔ وہ نابینا تھے۔ فرمانے لگے ابوبکر جس طرح تمہیں اپنی ذات سے محروم کرگیا ہے اسی طرح اپنی دولت سے بھی

محروم کر گیا ہوگا۔ میں نے کہا نہیں دادا جان! ایسا نہیں ہے۔ انہوں نے ہمارے لئے بہت کچھ چھوڑا ہے۔ پھر میں نے کچھ پتھر جمع کئے اور ان کو گھر کے ایک کونہ میں رکھ کر اوپر کپڑا ڈال دیا۔ پھر دادا کا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے گئی اور اُن سے کہا کہ یہ ہے وہ مال جو انہوں نے چھوڑا ہے۔ دادا نے کپڑے کے اوپر ہاتھ پھیرا اور فرمایا اگر وہ اس قدر مال چھوڑ گیا ہے تو پھر کچھ زیادہ فکر نہیں۔ یہ تم لوگوں کے لئے کافی ہوگا حالانکہ ابّا جان نے ہمارے لئے کچھ بھی نہ چھوڑا تھا۔ مگر میں نے چاہا کہ بوڑھے میاں پریشان نہ ہوں۔"

اس طرح حضرت صدیقؓ نے اسلام کو اپنایا اور یہ جان بوجھ کر اپنایا کہ کون سی چیز اپنا رہے ہیں۔ آپ کبھی اس خوش فہمی کا شکار نہ تھے کہ یہ راستہ آسان اور سہل ہے اور نہ ہی کسی کے سبز باغ دکھانے پر یہ راستہ آپ نے اختیار کیا تھا۔ جہاں آپ کو مصائب و تکالیف کا سامنا کرنا پڑا وہاں آپ کبھی آرام و راحت کے امیدوار نہ تھے۔ جہاں نقصان اٹھانا پڑا وہاں ہرگز کسی منفعت کے طالب نہ تھے۔ جہاں آپ کو اپنی قوم کی طرف سے دشمنی اور عناد کا تحفہ پیش کیا گیا، وہاں آپ کو مودت و محبت کی آس ایک دن بھی نہ تھی۔ جس خطرہ سے دوچار ہونا پڑا، توقع کے عین مطابق ان ساری دشواریوں کے مقابلہ میں جو چیز سپر کا کام دیتی رہی وہ صرف صبر و استقلال کا اثاثہ تھا۔ دین حق کی برتری اور دینِ باطل کے بودے اور ناپائیدار ہونے کا تصور تھا۔ ہدایت کی کامیابی اور ضلالت

کی نامرادی کا یقین واذعان تھا۔

تاریخ کے کسی انسان نے کسی دعوت کو اس جذبہ سرشاریت سے کبھی نہیں اپنایا۔ نہ ہی کسی انسان نے اپنے ضمیر کی آواز اور اپنے رب کی پکار کو اس طرح ہمہ تن گوش ہو کر سنا اور نہ ہی صداقت شعاری کسی انسان میں اس شان کے ساتھ جلوہ نما دیکھی گئی۔ جان و مال، والدین اور اولاد غرض ساری دنیا ایک رجلِ صادق کے کلمۂ حق پر تج دی گئی۔ جب کہ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ لوگ کسی چیز کی صداقت تو بڑی بلند آہنگی کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں مگر جب اس صداقت اور سچائی کی راہ میں قربانی کا سوال آتا ہے تو ایک دن کا رزق اور ایک گھنٹے کی راحت بھی قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

بلاشبہ ان اوصاف کے مالک انسان کے لئے صدیق ہی کا لقب سجتا ہے کوئی دوسرا لفظ اس انسانِ کامل کی خوبیوں کی عکاسی کا حق ادا نہیں کر سکتا۔

ہم نے بعض نقادوں کو چیں بجبیں ہوتے اور یہ اظہار خیال کرتے پایا ہے کہ دورِ جاہلیت کا ایک عرب دینی ہدایت کو اس بلند نظری اور دور نگاہی سے کیوں کر دیکھ سکا۔

ایسے لوگ درحقیقت غلط فہمی کا شکار ہیں۔

شاید ان کو یہ علم نہیں کہ جاہلی عرب حق آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ حق کی راہ میں زندگی کی بازی کیسے لگائی جاتی ہے۔ اسے علم تھا کہ حق جواد کیا شئے ہے۔ حق

عصمت و ناموس کیا چیز ہے۔ حقِ شرافت اور حقِ وعدہ اور ایفائے وعدہ کتنے بلند اور مستحسن اوصاف ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ خاص طور پر ان مخصوص لوگوں میں تھے جو ان حقوق کی محافظت و نگرانی اپنا فرض سمجھتے تھے اور جو کج روی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور غلط روی پر شدید نکتہ چینی کیا کرتے تھے۔

یہ بڑا انوکھا واقعہ ہوتا کہ ایک انسان ان حقوق کی نگہداشت میں تو اتنی تندہی کا ثبوت دے اور جب حق اکبر سے روشناس ہو تو یہاں اسی قسم کی تندہی اور چابکدستی نہ دکھائے جب کہ فطرت بھی سیدھی سادی ہو، ذوق بھی ستھرا ہو اور مزاج بھی پاکیزہ ہو۔

حضرت ابوبکرؓ جس دور میں پروان چڑھے، اس دور کے عقلاء اور دانشور ہر جگہ کسی نبیٔ آسمانی ہدایت کی آمد کے لئے چشم براہ کھڑے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہدایتِ آسمانی کا انتظار ہر اس دور میں یکساں طور پر ہوتا ہے، جب سوسائٹی اور اجتماعی معاشرہ میں فساد عام ہو جائے اور انسانی فکر و ذہن اس کو دور کرنے میں ناکام اور عاجز و درماندہ ہو کر رہ جائے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کے درخشاں اور تابندہ دور کے بعد جب بھی مسلمانوں میں ظلم و جور عام ہوا، جب بھی منکرات و فواحش کا دور دورہ ہوا، جب بھی گمراہی اور ضلالت نے دربار کی صورت اختیار کی، لوگ کسی ایسے "مہدی" کی راہیں دیکھنے لگے جو نمودار ہو کر ظلم و جور کی جگہ عدل و انصاف کا بول بالا کرے۔ منکرات و فواحش

کے سیلاب پر بند باندھ کر ان کی جگہ نیکیوں اور بھلائیوں کو فروغ دے اور ضلالت وگمراہی مٹا کر رشد و ہدایت کو نئے سرے سے زندہ کرے۔

بعثتِ محمدیؐ سے قبل کی تاریخ میں بھی کچھ ایسے لوگ ملتے ہیں جو حضرت داؤد یا حضرت اسماعیل علیہما السلام کی نسل سے ظہورِ ہدایت کے منتظر تھے۔

حضرت ابوبکرؓ نے اس قسم کی باتیں اپنے سفرِ شام میں سنی تھیں۔ ورقہ بن نوفل کی مجلسوں میں بھی اس قسم کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔ اور ان لوگوں کی زبانی بھی ایسی باتیں معلوم ہوتی رہتی تھیں جو جاہلیت کی تاریکی کے دشمن اور کسی نئی روشنی کے خواہشمند و منتظر تھے۔ اس ماحول میں محمد بن عبداللہؐ اٹھے اور اپنا پیغام حضرت ابوبکرؓ کے کانوں تک پہنچایا۔ یہ پیغام کوئی نیا یا انوکھا نہ تھا بلکہ اسی پیغام کو اس سے پہلے پوری عرب قوم کے جدِ اکبر حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام پیش کر چکے تھے یہ پیغام اتنا وسیع تھا کہ پوری انسانیت اس کے دائرہ میں آسکتی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ اگر اس دعوت کو قبول نہ کرتے تو آخر کوئی دوسرا کون ایسا کرتا؟

آپ نے اپنی سلیم فطرت سے مشورہ مانگا اور اس نے ٹھیک رہنمائی کر دی۔ اپنی عقل سے رجوع کیا اور اس نے حقائق کا تفصیلی جائزہ سامنے رکھ دیا۔ آپ نے اسلام کو جس طرح قبول کیا وہ آپ کی فطرت، آپ کے ماحول اور آپ کے زمانہ اور قوم کے عین مطابق تھا۔

آپ کا اسلام خلقِ کریم، حلم و بردباری، کشادہ ظرفی اور گرویدگیِ رسولؐ کا عکاس تھا۔ اپنے ہیرو کے ساتھ عشق و گرویدگی انتہائی بے لوث اور بے داغ تھی یہی وجہ ہے کہ ہر معاملہ میں انتہائی نرم مزاج اور حلیم ہونے کے باوجود جب سنتِ رسولؐ کا معاملہ پیش آتا تو سرتاسر شدت بن جاتے۔ بیعت کے بعد والے خطبے میں آپ نے خود اپنی زبان سے اس بات کی تشریح فرمادی ہے۔ فرماتے ہیں کہ "میں (نبیؐ کا) متبع ہوں۔ کوئی نئی چیز ایجاد کرنے والا نہیں۔"

بعض اوقات ایسے معاملات پیش آتے جن میں آپ کو کوئی واضح سنت نہ ملتی۔ ایسی صورت میں لوگوں کے پاس جاکر استفسار کرتے اور کوئی سنت معلوم ہو جانے کے بعد فرماتے کہ "خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اُس نے ہمارے اندر ہمارے نبیؐ کی سنت کے محافظ محفوظ رکھے ہیں۔"

اگر کبھی کوئی نیا طریقہ اختیار کیا تو اسی وقت جب پوری چھان بین کے بعد بھی کوئی سنت ہاتھ نہ آئی۔

پوری عمر نرمی اور رواداری میں شہرت رکھنے کے باوجود، جہاں اتباعِ رسولؐ کا معاملہ آتا معمولی نرمی اور رواداری برتنے کے لئے تیار نہ ہوتے۔

ایک نرم مزاج، حلیم و بردبار اور شفقت و رحمت سے لبریز انسان جب شدت دکھاتا ہے تو اس شدت کا راز لوگ عام طور پر سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ حالانکہ اگر یہ معلوم کر لیا جائے کہ اس کے پیچھے جذبہ گرویدگی و اتباع

کام کر رہا ہے تو اس پیچیدگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

آپ نے جیش اسامہؓ کی روانگی کے معاملہ میں پوری شدت دکھائی۔ اس لئے کہ اس کی پرچم بندی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی تھی۔ آپ اس معاملہ میں بھی کسی رواداری کے لئے تیار نہیں تھے کہ جس کمانڈر کو آنحضورؐ نے امارتِ جیش پر مامور فرمایا ہے اس کو اس کے منصب سے اتار کر اس کی جگہ کوئی نیا امیرِ لشکر مقرر کیا جائے "خواہ مدینہ اور اہلِ مدینہ کو بھیڑیے اچک لے جائیں اور پوری آبادی برباد ہو جائے"۔

آپ نے حربِ ارتداد میں بھی پوری سختی دکھائی۔ کیونکہ آپؓ ایک ایسی رسی تک چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مرتدین سے وصول فرمایا کرتے تھے۔

بعض لوگوں کے محاسبہ اور سزا کے معاملہ میں ہم آپ کو نرمی اور شدت کے درمیان متردد پاتے ہیں۔ مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ آپ اتباعِ سنت کے معاملہ میں کچھ نرم پڑ گئے تھے، صحیح نہیں۔

خالد بن ولیدؓ کے معاملہ میں آپ نے جس نرمی اور رواداری کا مظاہرہ کیا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اتباعِ رسولؐ کے معاملہ میں آپ کا شدت پسندی ختم ہو چکا تھا بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اُن کو آنحضورؐ کی زبانِ مبارک سے سیف اللہ کا لقب مل چکا تھا اور حضرت ابو بکرؓ کسی ایسے شخص کو معزول کرنا مناسب

نہ سمجھتے تھے جس کو رسول اکرمؐ نے کسی منصب پر مامور فرمایا ہو۔

آپ کی شدت اور نرمی کا راز ایک جرم کی سزا کے معاملہ میں بالکل عیاں ہو جاتا ہے۔ ایک عورت نے ایک جرم کیا تو اس کی سزا کو ناکافی قرار دیا اور ایک دوسری عورت نے جب اسی نوعیت کا جرم کیا تو اس کی سزا کو زیادتی پر مبنی قرار دیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ

("مہاجر بن ابی امیہ مخزومی نے آپ کو لکھا کہ یہاں ایک عورت نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ گیت گایا تھا اور ایک دوسری نے اپنے گیت میں مسلمانوں کی توہین کی تھی۔ میں نے سزا کے طور پر ان دونوں کے ہاتھ کٹوا دیئے۔ اور دانت باہر نکلوا دیئے تاکہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہ کر سکیں" آپ نے مہاجر کے اس عمل کو غلط قرار دیا اور لکھا کہ" اول الذکر عورت قتل کی مستحق تھی اور دوسری "قابلِ معافی تھی"۔

پھر مہاجر کو نرمی برتنے اور مثلہ نہ کرنے کی تلقین ان الفاظ میں فرمائی کہ "مثلہ کرنا گناہ ہے اور اس سے نفرت و بیزاری بڑھتی ہے۔")

نبیؐ کی عظمت کے معاملہ میں ہر سختی کم تھی۔ اور دوسروں کے معاملہ میں سب کچھ صرف قابلِ عفو و درگزر ہی نہیں بلکہ محمود و مستحسن تھا۔ ان دونوں سزاؤں میں امتیاز برتنا محض اندھی عقیدت و محبت پر مبنی نہ تھا بلکہ اس کے پیچھے ایک دوررس حکمت کام کر رہی تھی۔ اور وہ یہ کہ نبی کی عظمت پر حرف گیری کرنا

پورے دین کو منہدم کرنے کے مترادف تھا۔ مسلمانوں کی ہتک یا توہین کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اس کی حیثیت اس گناہ کی سی ہے جس کا ارتکاب ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے اختلاف کی بنا پر کرتا ہے۔ اس سے دین کی بنیاد پر کوئی حرف نہیں آتا۔

یہ واقعہ حضرت صدیقؓ کی نرم مزاجی اور شدت پسندی دونوں خصوصیتوں کا صحیح آئینہ دار ہے۔ ایک طرف خالص نرمی اور رواداری ہے اور دوسری طرف خالص شدت اور سختی۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے بعض ایسے معاملات میں تردد اور پس وپیش فرمایا جن میں نفع کا پہلو تو تھا مگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس کی مثال موجود نہ تھی۔ ایسا اس وجہ سے تھا کہ آپ کا فرطِ تقویٰ اس بات پر مجبور کرتا تھا کہ آپ سے کوئی ایسا فعل نہ سرزد ہو جائے جو آنحضورؐ کو ناپسند رہا ہو یا کوئی ایسا فعل متروک نہ ہو جائے جو حضورؐ کرتے رہے ہوں۔ اس قسم کی ہچکچاہٹ ہمیں جمعِ قرآن کے معاملہ میں ملتی ہے۔

جب حضرت عمرؓ نے آپ کو یہ مشورہ دیا کہ آپ قرآن کو یکجا جمع کرانے کا اہتمام فرمائیں تو آپ نے فرمایا "میں کوئی ایسا کام کیسے کر سکتا ہوں جس کی نظیر آنحضورؐ کی زندگی میں نہ ملتی ہو" اگرچہ بعد میں اس مشورہ کی قدر و قیمت اچھی طرح واضح ہو گئی اور اس کو قبول فرما لیا۔

آپ ایک وسیع الظرف انسان تھے۔ اس لئے کہ حلم و بردباری اور محبت و مودّت جو آپ کی طبیعت کا جزو لاینفک تھے ان کا یہی تقاضا تھا۔

آپ کے اندر اگرچہ فطری طور پر شدت بھی پائی جاتی تھی، اس لئے کہ گرویدگی اور عشق آپ کی فطرتِ ثانیہ بن چکا تھا۔ ہر وہ انسان جو اپنے دوست اور ساتھی کے اخلاص اور پاکیزگی سیرت کا دل سے معترف ہو اس کا مدافعت میں شدت اختیار کر جانا طبعی امر ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنے ہیرو کا گرویدہ و عاشق ہو گا، اس کی اتباع و اقتدار کے معاملہ میں انتہائی حریص ہو گا اور اس کے متعین کردہ راستے سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر ہونا گوارا نہیں کرے گا۔

اس مخصوص نوعیت کی شدت کے علاوہ حضرت ابو بکرؓ سراپا حلم و حکمت تھے۔ جب بھی آپ کے سامنے دو ایسے راستے آئے جن میں سے ایک عفو و درگذر کی طرف جاتا اور دوسرا سختی اور شدت کی طرف تو آپ ہمیشہ پہلا ہی راستہ اختیار فرماتے اور دوسرے سے اجتناب فرماتے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے اسیروں کے معاملہ میں آپ سے مشورہ طلب فرمایا تو آپ نے عرض کیا "اے رسولِ خدا! یہ لوگ اپنے ہی بھائی بند ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ ان کو فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے۔ فدیہ کے مال سے ہماری قوت میں اضافہ ہو گا اور اللہ تعالیٰ سے یہ بھی بعید نہیں کہ وہ ان کو جلد ہدایت فرما دے۔ اور وہ ہمارے ساتھی بن جائیں۔"

حدیبیہ کے مقام پر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ قریش مجتمع ہو کر مسلمانوں کو زیارت بیت اللہ سے روکنا چاہتے ہیں تو آپ نے مسلمانوں کو جمع کر کے دریافت فرمایا کہ "اے لوگو! مجھے مشورہ دو کہ کیا میں ان لوگوں کے گھر بار پر چڑھائی کر دوں جو ہم کو زیارتِ خانہ کعبہ سے روکنا چاہتے ہیں"۔

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا، "اے رسولؐ خدا! آپ زیارتِ خانہ کعبہ کے ارادے سے نکلے ہیں کسی سے جنگ کرنا مقصود نہ تھا۔ لیکن جب رکاوٹ پیدا کی جا رہی ہے تو آپ پیش قدمی فرمایئے۔ جو شخص ہماری راہ میں مزاحم ہو گا، ہم اُس سے ضرور جنگ کریں گے" ——— صرف اس سے جنگ کی جائے گی جو مزاحم ہو گا۔ جو مزاحم نہ ہو گا اس سے نہیں۔

لشکر اسامہؓ کو روانہ کرتے وقت بھی آپ کمزوروں اور ضعیفوں کے متعلق وصیت کرنی نہیں بھولے۔ عین روانگی کے وقت تلقین فرمائی کہ

"خیانت نہ کرنا۔ دھوکہ اور فریب نہ دینا۔ مثلہ نہ کرنا۔ بچے، بوڑھے اور عورت کو قتل نہ کرنا۔ کھجوروں کے باغات کو نذرِ آتش نہ کرنا۔ بکریوں گایوں اور اونٹوں کو بلا ضرورت ذبح نہ کرنا۔ تم ایسے لوگوں کے پاس سے بھی گذرو گے جنہوں نے اپنے آپ کو عبادت گاہوں کی چاردیواری میں محبوس کر رکھا ہے، ان سے تعرض نہ کرنا۔ ایسے لوگوں کے پاس سے بھی گذرو گے جو تمہاری خدمت میں انواع و اقسام کے کھانے برتنوں

میں دلیے حاضر ہوں گے۔ اُن کے کھانے کھاتے وقت ان پر اللہ کا نام ضرور پڑھ لینا۔ تم ایسے لوگوں کے پاس سے بھی گذرو گے جن کے سروں پر چوٹیاں ہوں گی اُن سے جنگ کرنا۔ اچھا (اب خدا حافظ! اللہ کا نام لے کر آگے بڑھو)

کسی دین پر ایمان رکھنے والوں کے اندر ایسی مثالیں کم ہی ملتی ہیں کہ انسان اپنے دشمنوں کے حق میں بھی اسی دینی رواداری کا ثبوت دے جس کا مظاہرہ وہ اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ کیا کرتا ہے۔

(اس کی غیر فانی مثال بھی ہمیں حضرت ابوبکرؓ کے اسلام میں ملتی ہے۔ عمر بن عاص نے جب بنان کا سر شام سے آپ کے پاس بھیجا تو آپ نے اس پر سخت اظہار نفرت فرمایا۔ عقبہ بن عامر نے اس عمل کے جواز میں یہ دلیل دی کہ دشمن بھی ہمارے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔" مگر آپ کے نزدیک یہ دلیل بے معنی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ" آئندہ میرے پاس کسی کا سر نہ لایا جائے۔ صرف خط کے ذریعہ اطلاع کر دینا کافی ہے۔")

غرض آپ اپنوں کے حق میں بھی مسلم تھے اور دشمنوں کے حق میں بھی مسلم تھے۔ دین قیم کا حقیقی مظہر و نمونہ ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

یہ تھا آپ کا رویہ اپنے دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ، یہ تھا آپ کا مسلک نرمی اور شدت کی حالت میں اور یہ تھا آپ کا راستہ ہر اُس دولہے

پر جس میں سے ایک راستہ نرمی کی طرف جاتا ہو اور دوسرا شدت کی طرف
آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے اور حضرت عمرؓ کے متعلق ارشاد فرمایا
ہے کہ

"اے ابو بکر! تمہاری مثال حضرت ابراہیمؑ جیسی ہے جنہوں نے فرمایا
تھا کہ جس نے میری اتباع کی وہ ہم میں سے ہے اور جس نے میری
نافرمانی کی (اُس کا معاملہ تیرے سپرد ہے) تو بڑا غفور اور رحیم ہے
یا پھر تمہاری مثال حضرت عیسیٰؑ جیسی ہے جنہوں نے فرمایا تھا کہ اگر
تو ان کو عذاب دینا چاہے گا (تو ایسا کرنے پر قادر ہے) یہ تیرے
ناچیز بندے ہیں اور اگر تو ان کو معاف کر دے گا (تو تجھ سے یہ بھی
بعید نہیں) تو غالب اور حکیم ہے۔"

"اے عمرؓ! تمہاری مثال حضرت نوحؑ جیسی ہے جنہوں نے فرمایا تھا
کہ پروردگار! کافروں میں سے کوئی متنفس بھی روئے زمین پر جیتا نہ
چھوڑ یا پھر تمہاری مثال حضرت موسیٰؑ جیسی ہے جنہوں نے فرمایا تھا
کہ پروردگار! ان کے مال و جائیداد برباد کر دے۔ ان کے قلوب سخت
کر دے تاکہ یہ ایمان نہ لا سکیں اور عذاب الیم سے دوچار ہوں۔"

حضرت ابو بکرؓ کی پوری زندگی خواہ حقوق سے تعلق رکھتی ہو، خواہ فرائض دینی سے
اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ جہاں کہیں نبیؐ کا اسوہ نظر آ گیا اُسی کو ذوق و شوق

سے اپنا لیا اور ساتھ ہی احتیاط کا دامن بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے دریافت فرمایا کہ "تم وتر کی نماز کب پڑھتے ہو"

آپ نے عرض کیا "ابتدائے شب میں"

آنحضورؐ نے یہی سوال حضرت عمرؓ سے بھی دریافت فرمایا۔

حضرت عمرؓ نے عرض کیا "رات کے آخری حصہ میں"

آپ نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا "تم نے حزم و احتیاط کا راستہ اختیار کیا" ——— اور حضرت عمرؓ سے فرمایا "تم نے عزیمت کے پہلو کو ترجیح دی۔"

نمازِ وتر کا وقت جیسا کہ ہر شخص کو معلوم ہے عشاء کے بعد سے طلوعِ فجر تک رہتا ہے۔ بعض ائمہ کی رائے میں یہ نماز فرض ہے اور بعض کی رائے میں سنت مؤکدہ۔

حضرت ابوبکرؓ نے اس کی ادائیگی میں تعجیل برتی۔ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اگر اس کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اس کو ابتدائے شب ہی میں ادا کر لیا جائے۔ حضرت عمرؓ اپنے نفس کے معاملہ میں انتہائی سخت اور اپنے عزم و ارادہ کے معاملہ میں حد درجہ پختہ تھے۔ آپ کو یہ یقین تھا کہ نماز فوت نہیں ہو سکتی اور نیند قابو سے باہر نہیں۔ اس بناء پر اس کو فجر سے پہلے ادا کرتے۔ نبی صلی

اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے جو یہ فرمایا کہ تم نے حزم واحتیاط کا راستہ اختیار کیا اور حضرت عمرؓ سے جو یہ فرمایا کہ تم نے عزیمت اختیار کی تو اس میں یہی حکمت تھی۔ ان دونوں حضرات کے اس ایک عمل میں جو فرق نظر آتا ہے وہ اسی ایک عمل تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کی جھلک دیگر تمام اعمال و افعال میں نمایاں نظر آتی ہے۔

ایسا عقیدہ یا ایسا دین جس نے اپنی پہنائیوں میں ان دونوں عظیم انسانوں ان دونوں مزاجوں اور ان دونوں عقلوں کو سمیٹ رکھا تھا اور جس نے ان دونوں کو اپنی اتباع اور تقلید کے طفیل امامت و عظمت کے منصب پر سرفراز کر دیا تھا فی الواقع اپنی بے کرانی میں سارے جہان کو سمو لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

صدیقؓ اور دولتِ اسلامیہ

ہم اپنی کتاب "عبقریت عمرؓ" میں لکھ چکے ہیں کہ دولتِ اسلامیہ کی بنیاد حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کے زمانہ میں پڑی۔ کیونکہ آپ نے لوگوں کے دلوں میں عقائد کو راسخ کیا اور تبلیغی اور جنگی وفود ملک کے مختلف حصوں میں بھیجے۔ عقائد کے رسوخ و نفوذ کے لئے آپ نے جو نمایاں کارنامہ انجام دیا وہ فتنۂ ارتداد کی سرکوبی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ حکومت کو بیرونی خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے جو کارنامہ آپ نے انجام دیا وہ یہ ہے کہ سرحدوں پر فوجیں بھیج کر دشمنوں پر اپنی حکومت کے داخلی استحکام کا سکہ جما دیا۔ ان دونوں کارناموں میں آپ کو دوسرے خلفاء پر اوّلیت اور فوقیت حاصل ہے۔

ہم حضرت عمرؓ کو بھی اگر دولتِ اسلامیہ کا بانی شمار کرتے ہیں، تو اس معنی میں نہیں کہ آپ کو خلافت کے کاموں میں اوّلیت حاصل ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم تاریخ میں آپ کو اسی مقام کا سزاوار پاتے ہیں جو دولِ منظّم

کے بانیوں کے شایان شان ہے۔ اور اس وجہ سے بھی کہ دولت اسلامیہ کی
نوعیت دوسری حکومتوں سے علیحدہ ہے۔ یہاں تاسیس حکومت اور منصب
حکومت سنبھالنے میں فرق ہے۔ دونوں ایک چیز نہیں۔ اس کا امتیازی نشان
وہ بنیادی عقیدہ ہے جس پر یہ حکومت قائم ہوتی ہے۔ غزوات و فتوحات اور
انتظامی امور و معاملات بنیادی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس طرح حضرت عمرؓ
تاسیس حکومت میں کسی نہ کسی نوع اپنی خلافت کے دور سے پہلے بھی بڑا حصہ لیتے
آپ ہی ہیں جنہوں نے اسلام کی اعلانیہ دعوت دی، کھلے بندوں اذانیں دیں اور
اپنے رعب و دبدبہ سے اسلام کی درماندگی کو عزت و طاقت سے بدل دیا۔"

ہم نے اس کتاب میں یہ بھی بتایا تھا کہ "انہوں نے جس دن سے اسلام قبول کیا
اسی دن سے اسلامی حکومت کی بنیاد چنتے رہے اور جب اس دار فانی کو چھوڑ
گئے تو یہ حکومت دنیا کی حکومتوں کے درمیان ایک مضبوط اور ناقابل تسخیر قلعہ
کی صورت کھڑی تھی۔

جو بات ہم حضرت عمرؓ کے متعلق کہہ چکے ہیں یعنی یہ کہ آپ دولت اسلامیہ کی
بنیاد اسی وقت سے استوار کرتے رہے جس وقت اسلام میں داخل ہوئے یہی
اسی معنی میں حضرت ابوبکرؓ پر بھی حرف بحرف صادق آتی ہے۔

اس بات کے ثبوت کے لئے صرف ان بڑے چھوٹے لوگوں کا ذکر کر دینا
کافی ہے جو حضرت ابوبکرؓ کی بدولت اسلام لائے۔ آپ کے اسلام قبول کرنے

جتنا گہرا اثر سرداروں اور رہنماؤں پر پڑا تھا اتنا ہی گہرا اثر غلاموں اور نچلے طبقوں پر بھی پڑا۔ قریش کے سر برآوردہ اور فاضل لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر نے اسلام کو اپنا دین بنا لیا ہے تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ جس دین کو آپ جیسے صالح، صاحب مروت، شریف، بے غرض اور سلیم الطبع انسان نے اختیار کیا ہے اُس کے اندر ضرور کچھ خوبیاں ہوں گی۔ اس لئے اس کی دعوت کو سننا اور اس پر غور و خوض کرنا چاہیئے۔ کسی انسان کا اس ذہنی مرحلہ پر پہنچ جانا اس بات کی علامت تھی کہ وہ عنقریب جاہلی عقائد اور تصورات کو خیرباد کہہ دے گا۔ بالخصوص وہ لوگ جن کے دل و دماغ میں جاہلی عقائد کے لئے کوئی کشش اور جاذبیت نہ تھی اور جن کو یہ خدشہ بھی نہ تھا کہ اسلام کے فروغ سے ان کی ذاتی مصلحت یا مفاد کو ضرر پہنچے گا۔

آپ کی وساطت سے اکابر اور زعماء کی جو منتخب اور چیدہ جماعت اسلام لائی اُس میں عثمانؓ بن عفان، زبیر بن عوامؓ، طلحہ بن عبید اللہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ عثمان بن مظعون، ابو عبیدہ بن الجراحؓ عبدالرحمٰن بن عوفؓ، عبداللہ بن عبدالاسدؓ ابو سلمہ اور خالد بن سعیدؓ جیسی بزرگ ہستیاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض بالکل نوجوان تھے۔ مثلاً حضرت سعدؓ اور زبیرؓ۔ یہ دونوں نوجوان اسلام کے اس وقت دست و بازو ثابت ہوئے جب وہ کٹھن مراحل سے گذر رہا تھا اور انہیں نیک طینت اور پاک باز جیالوں کی بدولت اسلام کو پائیداری اور استحکام

نصیب ہوا۔

حضرت صدیقؓ نے مظلوم و بےبس غلاموں کی ایک معتد بہ تعداد خرید کر آزاد کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن خاص حضرت بلالؓ بن رباح بھی انہی غلاموں میں سے تھے۔ آپ کا ظالم و جفاکار آقا آپ کو تپتی دھوپ میں لے کر نکلتا اور وادی مکہ میں پیٹھ کے بل لٹا کر اوپر بھاری بھاری تپتے پتھر رکھ کر کہتا کہ

"محمدؐ کا دین چھوڑ دو، ورنہ اسی حالت میں پڑے رہو گے اور اسی عالم میں موت کی آغوش میں پہنچ جاؤ گے۔"

مگر یہ مردِ حق پرست اس ظلمِ عظیم کے باوجود یہی کہتا رہتا کہ

"خدا ایک ہے، خدا ایک ہے۔"

(بعض اوقات اسی حالت میں بے ہوشی تک طاری ہو جاتی۔ حضرت ابوبکرؓ نے آپ کو پانچ اوقیہ سونے کے عوض خرید کر آزاد کر دیا۔ بعد میں کہا گیا کہ اگر آپ ایک اوقیہ کم بھی دیتے جب بھی ہم اس کو آپ کے ہاتھوں فروخت کر دیتے۔ حضرت صدیقؓ نے فرمایا، "اگر تم اس وقت ستر اوقیہ بھی مانگتے جب بھی ضرور خریدتا۔")

اسی طرح آپ غلاموں اور لونڈیوں کو بھاری بھاری قیمتوں پر خرید کر آزاد کرتے رہے۔

بعض اوقات آقاؤں نے جان بوجھ کر بھاؤ چڑھائے تاکہ آپ خریدنے سے قاصر رہیں یا اپنی کم سرمائیگی پر نادم ہوں۔ مگر آپ نے اپنے مال و دولت

کی کبھی پروا نہ کی اور مسلسل ان مظلوموں اور بے کسوں کو ان کے سنگدل اور بے رحم آقاؤں کے پنجے سے نجات دلاتے رہے۔ کمزوروں اور مجبوروں کے دل اس سلوک سے مسخر ہو گئے۔ اس سے اسلام کی شہرت کو بھی چار چاند لگ گئے۔ اسلام کی فضیلت و برتری واضح کرنے کے لئے یہ طریقہ دلائل و براہین سے بھی زیادہ موثر اور کارگر حربہ ثابت ہوا۔ بلکہ شاید یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہو کہ نبی دعوت کو جتنی تقویت اس رحیمانہ و مشفقانہ برتاؤ سے پہنچی اتنی تقویت ان شرفاء کے قبول اسلام سے نہیں پہنچی جو حضرت صدیقؓ کی وساطت سے ہی کاشانہ نبوت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے۔

غرض آپ جس دن سے اسلام لائے اُس دن سے منصبِ خلافت سنبھالنے تک اپنے ہر عمل کے ذریعہ اس عمارت کی تعمیر میں لگے رہے جس کے اولین معمول ہونے کا شرف بھی بانی حقیقی کے بعد خود آپ کو نصیب ہوا۔

سرداران قریش کی موجودگی میں خانہ کعبہ کے اندر کھلم کھلا دعوت و بنائے نبیؐ کے ساتھ ہجرت کرنا۔ مختلف وفود اور مشنوں کی راہ میں دولت لٹا دینا۔ اتباع و اقتدار کا اسوہ کامل پیش کرنا۔ ماہر انساب ہونے کے باعث قریش کے عیوب منظر عام پر لانا اور اپنی رائے و مشورہ اور جان و مال کے ذریعہ ان کے خلاف محاذ قائم کرنا۔ خلاصہ یہ کہ ہر وہ کام جو آپ نے اول روز سے منصبِ خلافت سنبھالنے تک انجام دیا وہ دولتِ اسلامیہ کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے

اور آپ کو اس عمارت کا ایک معمار ہونا ثابت کرتا ہے۔

بیعت کا زمانہ آیا تو اس میں تین اہم مہمات پیش آئیں۔ لشکر اسامہ بن زید رض کی روانگی، جنگ ارتداد اور عراق و شام کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے فوجیں مامور کرنا۔ انہیں تین مہمات پر عمارت کی باقی ماندہ اینٹیں چنی گئیں۔

مہم اسامہ رض کو بعض جدید مورخین زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور اس کو تاریخ کا ایک معمولی واقعہ شمار کرتے ہیں جس کا کوئی خاص اور نمایاں فائدہ اسلام اور مسلمانوں کو نہیں پہنچا۔ مگر ان لوگوں کا یہ خیال ایک فاش تاریخی غلطی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

حضرت صدیق رض کا یہ اقدام بڑے گہرے اور دور رس نتائج کا حامل تھا اور اس کے اندر نفع اور اصلاح کے بے پایاں پہلو مضمر تھے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ یہ مہم دولت اسلامیہ کی سیاست عامہ کا عنوان و دیباچہ ہے۔ اور اس کو اس دور کی سیاسیات میں اتنا ہی بلند مقام حاصل ہے جتنا اونچا مرتبہ کسی بھی دور کی سیاسی پالیسی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ رسول اکرم ؐ کی کلی اطاعت اس مہم کا بنیادی راز ہے۔ جب تمرد و عصیان وبا کی طرح پھوٹ پڑے تو ایسی صورت میں اطاعت کامل کروا لینا ہی سب سے بڑا کارنامہ ہوتا ہے۔

اس وقت بغاوت و سرکشی ایک عظیم خطرہ بن چکی تھی۔ مکہ اور مدینہ میں نفاق کا فتنہ سر اٹھا رہا تھا۔ بدوی قبائل ایک ایک کر کے مرتد ہو رہے تھے۔ حتیٰ کہ خود

حضرت اسامہؓ کو بھی فوج کی اطاعت پر اعتماد نہ رہا تھا اور وہ اس بات کے منتظر تھے کہ عنقریب ان کی جگہ کوئی اور امیرِ لشکر مقرر کیا جائے۔ غرض بغاوت و سرکشی نے وبائی صورت اختیار کر لی تھی اور کامل اطاعت کروانے کے سوا سلامتی کا کوئی راستہ نہ تھا۔

اس نازک موقع پر حضرت صدیقؓ کا بالغ مزاج اپنا کام کر گیا اور اُن کے عبقری دل و دماغ نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنے ہیرو کے اتباع و اقتدار کا حق ادا کیا۔ لوگوں نے آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ اگر یہ لشکر مدینہ سے باہر بھیج دیا گیا تو اس کی سالمیت خطرہ میں پڑ جائے گی۔ مگر اس بطلِ جلیل نے اس خطرہ کی پروانہ کی اور فرمایا۔

("خدا کی قسم! میں اس علَم کو نہیں کھول سکتا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں نے باندھا ہو۔ خواہ ہمیں پرندے اُچک لے جائیں۔ مدینہ میں درندوں کا دور دورہ ہو جائے اور امہات المومنین تک کو کتے گھسیٹتے پھریں۔ جیش اسامہؓ کی روانگی کسی حال بھی ملتوی نہیں کی جا سکتی")

حضرت ابوبکرؓ نے اپنی اس تقریر میں ایک ایسی بات کہہ دی کہ اگر ان کے علاوہ کوئی اور یہی بات کہتا تو اس کو امہات المومنین کی شان میں گستاخی تصور کیا جاتا مگر یہ بات کہنے والے وہ ابوبکرؓ ہیں جن کی ایک صاحبزادی خود ان امہات المومنین

میں سب سے اونچا مقام رکھتی ہیں۔ اس لئے یہ گستاخی گستاخی نہ رہی بلکہ عظمت کا ایک نشان بن گئی۔ اس وقت حق کی حفاظت اتنی ضروری تھی کہ اگر ناؤں بیٹیوں کو کتے بھی گھسیٹتے پھریں تو یہ گوارا کیا جا سکتا تھا مگر حق کی سرنگونی کسی حال میں قابلِ برداشت نہ تھی۔

جدید مورخین جو کچھ کہتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ مہم حضرت زیدؓ (حضرت اسامہؓ کے والد) کا قصاص لینے کے لئے روانہ کی گئی تھی حالانکہ ان کا قاتل خود غزوۂ موتہ میں مارا جا چکا تھا۔ پھر ایسی نازک گھڑی میں یہ مہم بھیجنے کی کیا ضرورت پڑی تھی کیوں نہ کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دی گئی؟

مہاجرین وانصار کی ایک بھاری تعداد ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو یہ رائے رکھتی تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی وجہ سے فی الحال اس مہم کو ملتوی کر دیا جائے۔ اس رائے میں پیش پیش خود حضرت اسامہؓ تھے۔

بعض لوگ یہ متبادل تجویز پیش کرتے تھے کہ اگر مہم بھیجنی ہی ہے تو فوج کی قیادت کسی سن رسیدہ اور ماہر جنگ کمانڈر کے سپرد کی جائے۔ حضرت عمر بن خطابؓ بھی اسی رائے کے حامی تھے۔

لیکن تمام لوگوں کی آراء کے برعکس حضرت ابوبکرؓ کی نظر میں اطاعت اور قانون کا مسئلہ ہر چیز پر مقدم اور ہر چیز سے اہم تھا۔ اگر مرتدین نے وبائی کی صورت نہ اختیار کر لی ہوتی تو اس راستہ کے سوا دوسرے راستے بھی مفید اور درست ہو

سکتے تھے۔ مگر یہاں سابقہ ایسی خطرناک آفت سے تھا جس سے بچاؤ کی صورت نہ کرنے میں دولت اسلامیہ کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی۔

جو اطاعت مقصود تھی ان کی مثال سب سے پہلے خود حضرت صدیقؓ نے قائم کی۔ مہم کو روانہ کرتے وقت پیدل چلتے رہے۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ آپ کی سواری کی مہار تھامے ساتھ ساتھ تھے۔

حضرت اسامہؓ نے کہا، "اے جانشین رسولؐ! آپ بھی سوار ہو جائیں، ورنہ میں خود سواری سے اترتا ہوں۔"

آپ نے فرمایا، "نہیں! نہ تم اترو نہ میں سوار ہوں گا۔ تھوڑی دیر کے لئے تو قدم خدا کی راہ میں غبار آلود کر لینے دو۔"

رخصت ہونے سے پہلے آپ نے امیر لشکر (اسامہؓ) سے درخواست کی کہ اگر تم حضرت عمرؓ کو میرے پاس رہنے دو تو میرے حق میں بہتر ہو گا۔ حضرت عمرؓ امیر لشکر کے حکم سے واپس چلے آئے۔ یعنی محمود کو بھی ایاز سے اجازت لینی پڑی۔ اس لئے کہ وہی اس وقت صاحب امر تھا۔

چلتے چلتے حضرت صدیقؓ نے حضرت اسامہؓ کو یہ نصیحت فرمائی: "دیکھو! وہی کچھ کرنا جس کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو۔ رسول اللہ کے فرمودات سے سرمو انحراف نہ ہونے پائے۔"

مذکورہ بالا وضاحت کے بعد جدید مؤرخین کی یہ بات قابل التفات نہیں رہ

جاتی کہ حضرت زیدؓ کے قاتل کے قتل ہو جانے کے بعد اس مہم کو اس نازک گھڑی میں روانہ کرنا خلاف حکمت و مصلحت بلکہ بے سود اور غیر مفید تھا۔

تھوڑی دیر کے لئے مذکورہ بالا پہلو سے بھی قطع نظر کر لیجئے اور انہیں حضرات کی یہ بات مان لیجئے کہ یہ مہم محض حضرت زید کے قصاص کے لئے بھیجی گئی تھی۔ جب بھی ان کی کوتاہ اندیشی پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کمانڈر کا میدان جنگ میں مقتول ہو جانا انفرادی جرم نہیں کہ صرف قاتل کو سزا دے دینے سے معاملہ ختم ہو جاتا۔ بلکہ یہاں تو سوال اس لشکر اور اس پوری قوم کی ساکھ کا تھا جس نے اس کو اپنی قوت و طاقت کا مظہر بنا کر بھیجا تھا۔ اگر دشمنوں کو یہ محسوس نہ کرا دیا جاتا کہ یہ لشکر اتنی قوت و طاقت کا مالک ہے کہ بروقت قصاص لے سکتا ہے تو پوری قوم کا وقار خاک میں مل جاتا۔

اگر یہ مہم اس وقت روانہ نہ کی جاتی تو کیا قبائل غسان و قضاعہ جو عرب اور روم کے نقطہ اتصال پر آباد تھے مسلمانوں سے نڈر نہ ہو جاتے اور ان کے دلوں سے اسلامی حکومت کا وقار جاتا نہ رہتا؟ اس بات کا محض امکان نہ تھا بلکہ ہونا ہی تھا۔ پھر کیا رومی یہ کمزوری محسوس کر کے فوراً چڑھ نہ دوڑتے اور غسان و قضاعہ کی مدد سے جو جی میں آتا کر نہ گذرتے؟ اور مزید یہ کہ کیا وہ لوگ بھی سر نہ اٹھا لیتے جو کسی ڈر یا خوف کی وجہ سے اب تک خاموش بیٹھے تھے؟ —— حقیقت یہ ہے کہ یہ سب ہو کر رہتا۔

اس مہم کا نمایاں اور اہم پہلو یہ ہے کہ جب اس کی روانگی کی خبر جزیرہ نمائے عرب میں پھیلی تو اس دور کے مورخین کے بیان کے مطابق جو قبائل ارتداد کے لئے پر تول رہے تھے وہ خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ اور ان کے ذہنوں پر یہ اثر ہوا کہ اگر مسلمانوں میں اس وقت غیر معمولی طاقت نہ ہوتی تو وہ طاقتور سلطنتوں پر دھاوا نہ بولتے۔ پس اگر لشکر اسامہ کو کسی خطرہ کے پیش نظر روک رکھنے کی کوئی وجہ موجود تھی تو اس کا بھیج دینا اس سے بھی بڑے خطرے کی مدافعت کے لئے ضروری تھا۔ اطاعت و فرمانبرداری کا درس دینا اس وقت کی سب سے اہم ضرورت تھی۔

یہی درس اس دور کے دوسرے مرحلوں میں بھی دہرایا گیا اور اس کے دہرائے جانے کی ضرورت بھی تھی۔ مرتدین کا معرکہ اس دور میں پیش آیا۔ یہ تو ہے ہی خصوصیت سے حضرت ابوبکرؓ کا کارنامہ۔ اس میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ مغرب کے وہ مصنفین جو انسان کو اس کی نفسیات کی روشنی میں دیکھنے کے عادی اور دعویدار ہیں، اس مسئلہ میں حضرت ابوبکرؓ کی شخصیت کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے اور حیرت انگیز بتاتے ہیں۔ مگر ان کی یہ حیرت و شبہ محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔

مرتدین کے خلاف جنگ کرنا بظاہر حضرت ابوبکرؓ کی حلیم الطبعی اور نرم مزاجی کے خلاف نظر آتا ہے اور بادی النظر میں آپ کا یہ موقف کچھ حیران کن ہے۔ آدمی سوچنے لگتا ہے کہ ایک حلیم و بردبار شخص کا اس موقع پر سخت رویہ اختیار کرنا اس کے مزاج کے منافی ہے۔ لیکن اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو بڑی آسانی سے یہ

بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ آپ کے اس موقف میں چنداں حیرت کا پہلو نہیں آپ نے اس وقت جس سختی و شدت کا مظاہرہ کیا اس وقت وہی آپ کے مزاج کا عین اقتضا تھا۔ اور اگر آپ ایسا نہ کرتے تو آپ کے متعلق یہ کہنا پڑتا کہ قوتِ غضب سے محروم تھے۔ جو بہر حال ناقابلِ تصور ہے۔

مرتدین کے ارتداد نے حضرت ابوبکرؓ کو برافروختہ کر دیا۔

یہ وہی صدیق تھا جو اپنے جگری دوست کے نام پر جان چھڑکتا تھا اور اپنے ہیرو کی ہر یاد پر تڑپ اٹھتا تھا۔ پھر وہ یہ دیکھ کر کیوں برہم اور آتش زیر پا نہ ہوتا کہ اُس کے محبوب دوست اور ہیرو کو قبر میں اترے مہینے بھی نہیں گذرے ہیں کہ بعض لوگ اُس سے اور اُس کی قائم کی ہوئی یادگاروں سے غداری پر آمادہ ہو گئے ہیں۔

یہ وہی مسلم صدیقؓ تھا جو کامیابی کی بشارت پر ایمان رکھتا تھا۔ جو قرآنی بشارت کے مطابق ایران و روم پر غلبہ کا اتنا گہرا اور راسخ یقین رکھتا تھا کہ اس کے لئے جان و مال کی بازی لگا دی مگر ایک لمحہ کے لئے بھی دل میں یہ شک نہ لایا کہ وہ ناکام ہوگا۔ وہ صدیقؓ آخر کیوں مرتدین کے خلاف برافروختہ نہ ہو جاتا جب کہ وہ یہ جان چکا تھا کہ حق بہر حال غالب ہو کر رہے گا اور قرآن کی یہ پیشین گوئی پوری ہو کر رہے گی کہ "خدا اپنے دین کو تمام دوسرے ادیان پر غالب کر دے گا۔" پس اس نے اسلام کی راہ میں جنگ کی۔ اس لئے کہ ایسا کرنا

ہی حق تھا اور حق انجام کار مظفر و منصور ہوا۔

یہ وہی ضعیف ولاغر صدیقؓ تھا جس کی خلافت کے اوّل دن ہی اس کے ساتھ استہزا و استخفاف کیا گیا۔ حالانکہ اس نے رکھ رکھاؤ سے گزاری تھی اور ہر شخص کے ساتھ مروّت برتی تھی کہ کوئی شخص اس کا استخفاف نہ کر سکے اور اس کو حقیر و کہتر نہ سمجھے۔ جس چیز سے وہ اس قدر دامن بچاتا رہا بدقسمتی سے اُس کو اسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اُس کے ساتھ زیادتی کرنے والوں نے اپنی نجی محفلوں میں اس کو ابوبکرؓ کی بجائے ابو الفصیل (اللہ میاں کی گائے) کی کنیت سے پکارنا شروع کر دیا۔ لیکن مزاج شناس یہ سمجھتے تھے کہ جس دن یہ ابو الفصیل ابو الفحول (شیر نر) کی صورت میں ظاہر ہو گا اس وقت طعنہ زنی کرنے والوں کو خود ہی یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان کا یہ استہزا کتنا بودا اور بے وقعت تھا۔

یہ وہی صدیقؓ تھا جس کا آہنی عزم نازک سے نازک موقع پر بھی غیظ و غضب کی قہرمانی طاقت کو مغلوب رکھتا تھا۔ فتنہ ارتداد اگرچہ بے پناہ غضب کا محرک بنا مگر اس وقت اس عزم کے استعمال کی نوبت اس لئے نہیں آئی کہ اس برافروختگی کو پی جانا خلافِ مصلحت تھا۔

یہ وہی صدیق عظیم تھا جو اتباعِ رسولؐ کے معاملہ میں اپنی مثال آپ تھا جہاں رسولؐ کی کوئی سنت نظر آئی اس سے چمٹ گیا۔ اس نے دیکھا کہ اسلام کے بنیادی فرائض میں سے ایک فریضہ نماز ہے۔ اسی پر اُس نے زکوٰۃ کو قیاس

کیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قبیلۂ ثقیف کے کچھ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے درخواست کی کہ ان پر نماز معاف کردی جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو دین نماز سے خالی ہو اس میں کوئی خیر و فلاح نہیں"۔ اسی طرح وہ دین بھی بے سود اور غیر مفید تھا جس میں زکوٰۃ ساقط کردی گئی ہو۔ مرتدین اس زعم میں آئے تھے کہ وہ مسلمان ہیں اور اسلام کے فرائض بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اور چونکہ زکوٰۃ کوئی دینی فریضہ نہیں۔ اس لئے وہ اس کو ادا نہیں کریں گے۔ مگر حضرت صدیقؓ نے ان کے اس زعم کو باطل قرار دیا۔

حضرت صدیقؓ نے فتنہ ارتداد کو جو درس دیا وہ آپ کے مزاج کی افتاد کے عین مطابق تھا اگرچہ بظاہر معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔

مورخین نے ارتداد کی جنگوں پر جس قدر خامہ فرسائی کی ہے اتنا شاید صدر اسلام کے کسی اور واقعہ پر نہیں لکھا۔ انہوں نے شرک و ارتداد کو جن دو تاریخی مرحلوں میں رکھ کر تقابلی مطالعہ کیا ہے اور ان دونوں کے فرق کو جس عرقریزی کے ساتھ اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے وہ واقعی بڑا قابل قدر کارنامہ ہے۔ اسلام کے پہلے مرحلے کی دعوت نے شرک کا قلع قمع کیا اور یہ پہلی فتح تھی دین جدید کی۔ اسلام کے دوسرے مرحلے کی دعوت نے مرتدین کا سر کچل کر گویا اس نوزائیدہ دین کو حیاتِ نو بخش دی اور دعوت اسلام نئے سرے سے ارتقاء کی راہ پر گامزن ہو گئی۔ مورخین کے موازنہ کا اتنا حصہ تو صرف صحیح نہیں بلکہ قابل ستائش

بھی ہے۔ مگر اس سے آگے جہاں انہوں نے فتنۂ ارتداد کو اس رنگ میں رنگنے کی کوشش کی ہے جو اس کا اپنا نہیں ہے اور جہاں اس کو اس زاویہ نظر سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی جس کے بغیر اس کو سمجھنا ناممکن ہے وہاں ان کا موقف انتہائی کمزور اور بودا ہے۔ بالخصوص ان مورخین کا موقف بڑا مضحکہ خیز ہے جو اپنی اغراض کے تحت جان بوجھ کر محض اس لئے تحریف و تاویل سے کام لیتے ہیں کہ ان کو اسلام کو مطعون کرنے کا موقع ہاتھ آسکے۔ اور وہ یہ کہہ سکیں کہ قبائل عرب کا ارتداد اس بات کی دلیل ہے کہ وہ جبر و اکراہ کے ذریعہ اسلام میں داخل ہوئے تھے اور جب یہ مجبوری ختم ہوگئی تو پہلی فرصت میں باغی ہو گئے۔

اگر ان حضرات کو فی الحقیقت حقیقت جاننے کی خواہش ہوتی تو ان کو اتنی دور کی کوڑی لانے کی ضرورت پیش نہ آتی اور یہ اس مسئلہ کو اس نظر سے دیکھتے جس کا وہ مستحق تھا۔

اس مقام پر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ کی حقیقت پر روشنی ڈالیں اس بغاوت کا تعلق انسان کے مزاج و افتاد کی اس فطری رفتار سے ہے، جو اس قسم کے حالات میں کسی بھی ایسے دین و مذہب کے لئے انوکھی نہیں جو عوام و خواص میں یکساں مقبولیت حاصل کر چکا ہو۔ بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے یہ کہنا صحیح ہے کہ خالص فلسفیانہ نظریات، حکیمانہ افکار اور دوسرے علوم و فنون کے ساتھ بھی ایسا ہی حادثہ پیش آتا رہا ہے۔ حالانکہ ان کا

تعلق عوام سے نہیں بلکہ اس مخصوص طبقے سے ہوتا ہے جو فکر و تحقیق کا عادی ہوتا ہے۔ سقراط کے بعد آخر حکمت کو کیا کچھ نہیں پیش آیا؟ ڈارون کے بعد اس کے فلسفۂ ارتقاء کے ساتھ آخر کیا کچھ نہیں بیتا؟ کانٹ، بنتام اور برگسان کے بعد علمِ اخلاق کی دنیا میں وہ کون سا انقلاب تھا جو نہیں آیا؟

ارتدادِ عرب جس صورت میں پیش آیا اس کا اس صورت میں پیش آنا اسی طبعی اور فطری قانون کے مطابق تھا۔ مگر اس سے اغراض پرست مؤرخین نے جو نتیجہ نکالا ہے اس پر تو عقل سر پیٹ کر رہ جاتی ہے۔

کیا یہ نام نہاد مؤرخ حضرات یہ امید رکھتے ہیں کہ اس نئے دین کو جزیرہ نمائے عرب کے ایک ایک متنفس کے دل کی گہرائیوں میں اس طرح اتر جانا اور اس کے رگ و ریشہ میں اس طرح پیوست و جاگزیں ہو جانا چاہیے تھا کہ اس کے بعد اس کے لئے اس سے پھر جانا یا ارتداد اختیار کر لینا ناممکن ہو جاتا؟ یا وہ اس دین پر یہ فرض عائد کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اتنے قلیل سالوں میں انسانی فطرت کے جذبہ ہوا و ہوس کا ہر اثر و نشان مٹا دیتا۔ جاہلی زعماء کے دلوں سے اقتدار و مسند کی خواہش بیک جنبشِ قلم کھرچ کر پھینک دیتا۔ جاہلیت کے معیارِ اخلاق و فضیلت کو آن کی آن میں محو کر دیتا اور آنکھ جھپکنے سے پہلے ان تمام سازشوں کے دروازے بند کر دیتا جن کا جال پڑوس کی اجنبی حکومتوں اور خود داخلی دھڑوں نے عرب کے چپہ چپہ میں بچھا رکھا تھا؟ یا یہ حضرات یہ بات

دیکھنے کے خواہشمند ہیں کہ بدوی قبائل کو چند سالوں کے اندر اتنا راسخ العقیدہ ہو جانا چاہیے تھا جتنا نجران کے قبائل اور غسانسہ صدیوں کے بعد بھی دین مسیحی میں راسخ نہ ہو سکے تھے۔

اگر انہوں نے یہ خیال قائم کر رکھا ہے تو اس خام خیالی کی ذمہ داری خود ان پر عائد ہوتی ہے نہ کہ نفس واقعہ، عقلِ سلیم اور اسلام پر۔

وہ واقعات وحادثات جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں یا آپؐ کی وفات حسرت آیات کے بعد پیش آئے وہ خود اس بات کے شاہد ہیں کہ اسلام کا ارتقاء وعروج طبعی اور فطری تھا۔ انہیں میں سے ایک اہم واقعہ یہ فتنۂ ارتداد بھی ہے۔

دعوتِ اسلامی کے عروج پر پہنچنے اور عوام وخواص کے اس دین میں داخل ہو جانے کے بعد نبیؐ کی ذات مرکز ومحور کا کام دیتی تھی یا بقول شاعر ؎

فانک موضع القسطاس منها
فتمنع جانبیها أن یمیلا

"آپؐ اس ملت کی میزان کا مرکز توازن ہیں۔ آپؐ ہی کی بدولت اس کے دونوں پلڑوں میں توازن قائم ہے۔"

جب مرکزِ توازن ہی نہ رہا تو اس کے برعکس صورتِ حال کا پیش آنا اور اضطراب وانتشار کا اس وقت تک کے لیے سر اٹھا لینا فطری امر تھا جب تک اس کا

مخصوص اثر زائل نہیں ہو جاتا اور حالات دوبارہ معمول پر نہیں آجاتے۔

اسی فطری تقاضے کے مطابق ہر گروہ کے اندر اس کے اپنے حالات و ظروف کی مناسبت سے انتشار و اضطراب رونما ہوا۔

انصار جن کے اسلام کے بارے میں شک کرنا بھی گناہ سے کم نہیں، اسی اقتضاء کے مطابق سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر نیابت رسولؐ کا فیصلہ کرنے لگے۔ کیونکہ یہ فیصلہ ان کے خیال کے مطابق اسی وقت کرنا ضروری تھا۔

مہاجرین بھی اسی اقتضاء کے مطابق دو گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک گروہ نے حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور ایک گروہ نے ایسا نہیں کیا۔ موخر الذکر گروہ میں خود نبیؐ کے خاندان کے افراد بھی شامل تھے۔ حالانکہ ان کا ایمان سب سے زیادہ راسخ اور ان کی دینی غیرت سب سے زیادہ قوی تھی۔

مکہ میں جو منافقین کی ایک معتد بہ تعداد موجود تھی وہ بھی اسی اقتضاء کے مطابق بغاوت کے لیے پر تولنے لگی۔ اور اگر ان کو حکومت کی پکڑ کا اندیشہ نہ ہوتا تو یہ اپنی نیت کو ضرور پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتے۔

ان مختلف گروہوں کے علاوہ متعدد قبائل بھی ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے۔ کوئی مرکز حکومت سے قریب تھا اور کوئی دور۔ کوئی اسلام سے زیادہ وابستگی رکھتا تھا اور کوئی کم۔ اسی تناسب سے ان کے اندر بھی انتشار و اضطراب رونما ہوا۔

جو قبائل گہوارہ اسلام سے قریب تھے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تو پوری عقیدت و وابستگی رکھتے تھے مگر آپؐ کے جانشین صاحبِ امر کی اطاعت اور فرمانبرداری پر رضامند نہ تھے ۔

اطعنا رسول اللہ اذ کان بیننا

فیا لعباد اللہ ما لابی بکرا

"جب تک رسولؐ ہمارے درمیان تھے ہم آپؐ کی اطاعت کرتے رہے۔
خدا کے بندو! ہمیں یہ تو بتاؤ کہ ہم ابو بکرؓ کی اطاعت کیوں کریں؟"

انہیں قبائل میں کچھ ایسے بھی تھے جو زکوٰۃ کو دینی فریضہ تو سمجھتے تھے مگر وصول کرنے والے کے بارے میں ان کا نقطہ نظر مختلف تھا۔ وہ قرآن کریم کی مذکورہ ذیل آیت کی من گھڑت تاویل اپنے مؤقف کی حمایت میں پیش کرتے تھے۔

خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم	اے نبیؐ! ان کے اموال میں سے
وتزکیھم بھا وصل علیھم ان	کچھ صدقہ لے کر ان کی تطہیر و تزکیہ
صلوٰتک سکن لھم۔	کر اور ان کے لئے دعا کر۔ تیری
	دعا ان کے لئے باعثِ سکون ہو گی

یہ لوگ اسی آیت کی آڑ لے کر یہ کہنے لگے کہ ہم زکوٰۃ اسی کو دے سکتے ہیں جس کی نماز و دعا میں ہمیں سکون ملے۔ اس کج فہمی کی بنا پر انہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔

جو قبائل دور دراز علاقوں میں آباد تھے ان کے انتشار و اضطراب کی وہی
نوعیت تھی جو اتنے دور دراز علاقوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔
یمن کے لوگ جو مرکز سے کافی دور تھے ان کی حالت یہ تھی کہ وہ قدیم زمانہ
سے تخت و تاج کے مالک چلے آ رہے تھے۔ چند خاندان مدت ہائے دراز سے
کبھی حبشیوں کا سہارا لے کر، کبھی ایرانیوں کی مدد سے اور کبھی خود اپنے ملک کے
باشندوں کی مرضی سے اس علاقہ پر حکمرانی کرتے رہے تھے۔ اس علاقہ میں قدیم
زمانہ سے کہانت کا بھی زور تھا جو کچھ کتابی اور کچھ غیر کتابی عقائد کا مجموعہ تھا۔
جب حالات نے ذرا رُخ بدلا تو ان سارے اسباب و عوامل نے مل کر اپنا کام
کیا اور اضطراب و انتشار کی صورت اختیار کر گئے

اسود عنسی انہیں حالات میں مدعی نبوت اسود عنسی بھی کچھ دیر کے لئے کامیاب ہو گیا۔ یہ
ایک بد ہیئت اور مکروہ شکل و صورت کا آدمی تھا۔ اس کی مقبولیت کی وجہ یہ تھی
کہ اس کے اندر وہ بہت سی چیزیں پائی جاتی تھیں جو یمنیوں کے یہاں علاماتِ
کہانت میں شمار ہوتی تھیں۔ اور جو ان کے قدیم کاہن سطیح کی علامات سے بہت
حد تک ملتی جلتی تھیں۔

سطیح کاہن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ نرا گوشت ہی گوشت تھا۔ اس کے
اندر ہڈی نام کو نہ تھی یا اگر ہڈیاں تھیں تو اتنی نرم کہ سارا جسم کپڑے کی طرح تہہ بہ
تہہ لپیٹ جاتا تھا۔ سر کی حالت یہ تھی کہ اس کے اندر انگلیاں دھنس جاتی تھیں

اسود عنسی سے پہلے ایک اور کاہن شقی ہو گذرا تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ اس کے اعضاء و جوارح اس طرح بنے تھے کہ وہ نصف آدمی نظر آتا تھا۔ اس کی شہرت بھی اسود عنسی کی کہانت کے لئے مددگار ثابت ہوئی۔ اور اس طرح یہ بدہیئت و بدنما شخص اپنی کامیابی کے خواب دیکھنے لگا۔

اسود عنسی اور اس جیسے دوسروں شعبدہ بازوں نے اپنی مطلب برآری کا یہ راستہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعید ہی میں عرب کے مختلف علاقوں میں اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے اسلام کو سمجھا ہی نہیں تھا اور نہ یہ جان سکے تھے کہ یہ ایک اصلاحی اور انقلابی دعوت ہے جس کا مقصد خیر و فلاح قائم کرنا ہے۔ ان کی عقل کی تنگ دامانی اور کوتاہ نظری نے اس کو زیادہ سے زیادہ جو اہمیت دی وہ یہ کہ یہ محض انہیں جیسے ایک کاہن کی جعلسازی ہے جو خوش قسمتی اور اتفاق سے کامیاب ہو گئی۔ اس لئے ان کو بھی حق پہنچتا ہے کہ وہ بھی اپنی نفع اندوزی کے لئے جدوجہد کر دیکھیں کیونکہ ان کے پاس بھی سحر و فسوں اور مکر و فریب کے ہزار دام ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں اس قسم کے فتنوں نے کہیں کہیں سے سر اٹھانا تو شروع کر دیا تھا مگر ان کو اس وقت زور پکڑنے یا فروغ پانے کا موقع نہ مل سکا۔

یہ سارے فتنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دارِ فانی سے رخصت کا انتظار کر رہے تھے۔ اور جب یہ حادثۂ عظیم ہو گیا تو پورے جزیرہ نمائے عرب

میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک قیامت صغریٰ برپا ہو گئی اور تمام مخالف عناصر کھولتے ہوئے لاوے کی طرح ابل پڑے۔ ان میں اہل حرص و ہوا بھی تھے اور جاہل و بدوی قبائل بھی۔

تاریخ جہاں ہمیں یہ پتہ دیتی ہے کہ ہر دور میں کچھ لوگ آدمیت کی بالکل ابتدائی حالت و شکل میں ہوتے ہیں، وہیں یہ بھی بتاتی ہے کہ ایسے لوگوں کے اندر اس قسم کی ہنگامہ آرائی اور شورش کا پایا جانا چنداں تعجب خیز نہیں۔ خواہ ان کا تعلق کسی دین اور کسی زمانہ سے ہو۔ بعض اوقات ایک بدوی قبیلہ جس پر بدوت کا گہرا رنگ چڑھا ہوا ہو اور سینکڑوں سال سے دین مسیحی یا یہودیت کا پیرو بھی رہا ہو اس قسم کے نفسیاتی موقع پر ارتداد اختیار کر لیتا ہے۔ مگر ماہرین نفسیات کی نگاہ میں سینکڑوں سال کا یہ انقلاب بھی کچھ تعجب خیز نہیں ہوتا لیکن معلوم نہیں کیوں کچھ لوگوں کے نزدیک عرب کے ان بادیہ نشینوں کا دس سال کی قلیل مدت کے بعد وقتی ارتداد اختیار کر لینا باعث حیرت ہے؟

یہ ہے فتنۂ ارتداد کی حقیقت جس تک ایک منصف مزاج مورخ محمدی دعوت سے قطع نظر کرتے ہوئے محض تاریخی نقطہ نظر سے پہنچتا ہے۔ اسی تاریخی حقیقت کو سامنے رکھ کر ہم اس نتیجہ تک بھی پہنچتے ہیں کہ یہ فتنہ اس دعوت کے لئے ایک بھٹی ثابت ہوا، جو اسے تپا کر ایک طرف زیغ و نفاق اور شک و ریب کا جھاگ اوپر لے آیا اور دوسری طرف ایمانِ محکم، قربانی کے بے لوث جذبہ اور غیر متزلزل

یقین جیسے اوصاف کو نکھار کر علیحدہ کر دیا اور جس نے تفکر و تدبر، شجاعت و بہادری اور ایثار و حمیت کے ایسے غیر فانی نمونے لوگوں کے سامنے پیش کر دیئے جن سے تاریخ ادیان کے صفحات ہمیشہ روشن رہے ہیں۔

اس کی ایک شہادت طلیحہ کذاب کے ایک آدمی کی زبانی سنیئے۔ جس سے خود طلیحہ نے یہ سوال کیا تھا کہ "تم کیوں شکست کھا جاتے ہو؟"

اُس نے جواب میں کہا "میں اس ہزیمت و ناکامی کا راز بتاتا ہوں۔ ہمارا ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس کا ساتھی اُس سے پہلے موت کے گھاٹ اتر جائے اور جن لوگوں سے ہمارا مقابلہ ہے ان کا ہر آدمی اپنے ساتھی سے پہلے مرنا چاہتا ہے"

یہ مرحلہ اسلامی دعوت کے لیئے بھی بڑی آزمائش و امتحان کا تھا۔ اور ان ہنگاموں اور شورشوں کے لیئے بھی جن کے پیچھے فوجی طاقت، قبائلی عصبیت اور مکر و فریب کام کر رہے تھے۔

اگر اسلامی دعوت کی پشت پر بھی صرف فوجی طاقت، قبائلی عصبیت اور مکر و فریب ہی کا اثاثہ ہوتا تو فتنہ ارتداد کا چھوٹے سے چھوٹا مدعی نبوت بھی اسلام کے مقابلہ میں کامیاب ہو جاتا کیونکہ ہر دعویدار نبوت کے پیچھے عصبیت کے نشہ میں سرمست قبائل کا انبوہ تھا۔ ان کی اس سرمستی کا اندازہ ان کے اس نعرہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ "ہمارا جھوٹا نبی مضر اور قریش کے سچے نبیؐ سے بہتر ہے"۔

اسلامی دعوت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ امتحان سے اپنا دامن صاف بچا کر نکل گئی اور اپنے بے لاگ، اٹل اور دائمی اصولوں پر کوئی آنچ نہ آنے دی۔ خطرات بھی خود ہی پیدا ہوئے اور سلامتی کے اسباب بھی خود ہی مہیا ہو گئے۔

طلیحہ کذاب کے جسم کی طرح یہ دعوت اوہام و اباطیل میں لپٹا ہوا جسم نہ رکھتی تھی کہ اس میں نہ تلوار اثر انداز ہو سکتی اور نہ تیر و سنان۔ بلکہ یہ مادی جسم رکھتی تھی، جس کو اگر ایک طرف تلوار کاٹ سکتی تھی تو دوسری طرف اس کے پاس اپنی حفاظت کے لئے سپر بھی موجود تھی۔

تنقید فتنۂ ارتداد کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ان بہت سے خطرات کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا جو مرتدین کی طرف سے پیش آ سکتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرتدین تتر بتر اور منتشر تھے اور کسی دینی یا سیاسی رشتۂ وحدت میں منسلک نہ تھے۔ اس کے برعکس ان کے اس جارحانہ اقدام نے اہل مدینہ کی مدافعانہ اسپرٹ پوری طرح بیدار کر دی تھی اور وہ ایک مضبوط رشتۂ وحدت میں منسلک ہو گئے تھے۔ یہی حال اہل مکہ کا بھی تھا۔ چنانچہ یہ سارے لوگ اتحاد و اتفاق کی ایک مضبوط چٹان بن کر اٹھ کھڑے ہوئے اور یہ تمیز بھی اٹھ گئی کہ اب تک کون لوگ خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں اور کون باقی ہیں۔ بلکہ اس موقع پر سربراہی اکثر وہ لوگ کر رہے تھے جو اب تک بیعت سے محترز رہے تھے۔

مرتدین کی بنیادی غلطی ان کی عجلت پسندی تھی جو مسلمانوں کے حق میں مفید

ثابت ہوئی۔ انہوں نے اپنی کثرت کے گھمنڈ میں آکر اور مسلمانوں کی قلت تعداد دیکھ کر مدینہ پر دھاوا بول دیا۔ اور حملہ کی اس طرح تیاری نہ کی جس منظم طریق پہ مسلمانوں نے اپنی مدافعت کا سامان کر رکھا تھا۔ مسلمان مہاجرین و انصار یک جان دو قالب ہو کر اپنے دین و ایمان اور اپنے گھر بار کی حفاظت کیلئے سینہ سپر ہو گئے اور آن کی آن میں مرتدین کے غیر منظم حملہ کو ان کی شکست فاش اور ناکامی میں بدل دیا۔ اگر مرتدین اس وقت یہ حملہ نہ کرتے اور صحرائی علاقہ میں ہی گوریلا جنگ جاری رکھتے تو شاید یہ ان کے حق میں ان کے نقطہ نظر میں بہتر ہوتا۔ اگرچہ اس صورت میں بھی کامیابی کی گارنٹی نہ تھی۔

مسلمانوں کے عزم و یقین کو اس بات سے مزید تقویت پہنچی کہ جیش اسامہ بہت قلیل مدت میں مظفر و منصور واپس آگیا۔ راجح ترین روایت کے مطابق یہ مہم دو ماہ سے بھی کم مدت میں سر کرلی گئی۔ اور مجاہدین اپنے ہمراہ بہت سا مال غنیمت بھی لائے۔ نیز نہ ان کا کوئی جانی نقصان ہوا اور نہ ان کے عزم و حوصلہ میں کوئی فرق آیا۔

قبائل نے جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں نے رومیوں جیسی صاحب سطوت و جبروت حکومت پر حملہ کر دیا اور کامیاب و کامران مع بے شمار اموال غنائم واپس بھی آگئے تو اُن کے دل دہل گئے۔ اور انہوں نے سپر ڈال دینے کے سوا چارہ نہ دیکھا۔ صحرا کی خاک چھاننے والے اور اس کے طول و عرض میں بے

خانماں بھرنے والے غیر منظم قبائل آخر اس سے آگے کر ہی کیا سکتے تھے، جب کہ وہ یہ محسوس کر چکے تھے کہ ان کا مقابلہ ایک بنیان مرصوص سے ہے۔ ان کے اندر ایسے لوگوں کا فقدان نہ تھا جو مطلع دیکھ کر آئندہ حالات کا اندازہ کر لیتے تھے۔

جیش اسامہ رض جزیرہ نمائے عرب میں خود ایک بہت بڑی طاقت تھا لیکن اس کی شہرت و دبدبہ نے اس کی اپنی اصلی قوت و طاقت سے بھی زیادہ کام کیا۔

چنانچہ جو مرتدین پیش قدمی کر رہے تھے وہ اپنی جگہ پر رک گئے اور ان کو مزید آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ جو مجتمع ہو رہے تھے وہ بکھر گئے۔ جو بغاوت کے لئے پر تول چکے تھے انہوں نے صلح کر لی اور اس موقع پر صرف ہیبت و دبدبہ نے وہ کام کیا جو اسلحہ اور فوج سے بھی زیادہ کارگر اور مؤثر ثابت ہوا۔

یہ ہے فتنہ ارتداد کا پورا پس منظر مع اپنے جملہ پہلوؤں کے جن میں خطرات بھی موجود تھے اور سلامتی کے قوی اسباب بھی۔

اس فتنہ کا مقابلہ حضرت ابوبکر رض نے شروع سے آخر تک بڑے حسن و خوبی کے ساتھ کیا اور اس کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جو تشنۂ علاج رہ گیا ہو۔ آپ نے فتنے کی پہلی آواز اٹھتے ہی بڑے حزم و احتیاط سے قدم بڑھایا اور اس وقت تک پورے تدبر کے ساتھ آگے ہی بڑھتے رہے جب تک فتنہ نے ہتھیار نہیں ڈال

دیئے اور حالات حسب سابق معمول پر نہیں آ گئے

اس فتنہ میں حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے جو سب سے بڑا تدبر بروئے کار آیا وہ یہ تھا کہ آپ نے مرتدین کو قرار واقعی سزا دی۔ یہ لوگ تمرد و سرکشی پر تل گئے تھے۔ خیر خواہانہ مشوروں اور دھمکیوں سے بھی بے نیاز ہو چکے تھے اور انہوں نے جرم کیشی کو اپنا شیوہ بنا لیا تھا۔ اس لئے اس بات کے مستحق تھے کہ ان کو ان کے جرم کے مطابق ہی سزا دی جائے۔ یہ لوگ عظمتِ دین کو پائے حقارت سے ٹھکرا چکے تھے اور مال و دولت کی محبت میں اس حد تک دیوانے ہو گئے تھے کہ دین کے حقوق سے بھی انکار کر بیٹھے۔ اس لئے وہ ایسی ہی سزا کے مستحق تھے جس سے عبرت حاصل کریں اور جسے مدت العمر تک یاد رکھیں۔ وہ اس بات کے مستحق تھے کہ جس مال کی محبت میں یہ فتنہ انہوں نے کھڑا کیا اور شورش و نقض امن تک پہنچ گئے وہ مال بھی ان سے چھین لیا جائے۔

چنانچہ ان کی جائیدادیں، ان کے گھر بار، ان کے مویشی، ان کی چراگاہیں اور پانی کے گھاٹ سب کچھ فوج کی تحویل میں دے دیا گیا۔ حضرت خالدؓ نے بعض مواقع پر نرم پالیسی اختیار کرنی چاہی مگر پیکر رحمت و رافت ابوبکرؓ نے نرم پالیسی کو بروئے عمل نہیں آنے دیا۔ بلکہ پورا قصاص لینے کی ہدایت کی۔ مسلمانوں کا قتل عام کرنے، لوٹ اور غارت گری کا بازار گرم کرنے اور پھر نصیحت اور دھمکی پر کان نہ دھرنے کے بعد نرمی اور رواداری کا سوال

آخر کہاں باقی رہ گیا تھا؟

ایک عمل کا بدلہ دوسرے جوابی عمل سے ہی دیا جانا چاہیئے۔ (اگر ایک طرف سے تحقیر و توہین ہو تو دوسری طرف سے سخت گیری مطلوب درکار ہے۔ اگر ایک طرف مال و دولت کی گھناؤنی ہوس ہو تو دوسری طرف سے جواب میں اموال کی ضبطی ہی ہونی چاہیئے۔ اگر ایک طرف انسانی جان کا عظمت و احترام دل سے اٹھ گیا ہو تو اس ناپاک عمل کا جواب تلوار ہی سے دیا جانا چاہیئے۔ اگر ایک طرف کچھ نافرمان اور غدار لوگ ہوں جو مال و متاع کو اپنے ایمان پر بھی ترجیح دیتے ہوں تو دوسری طرف مجاہد صفت، اخلاص پیشہ اور دین و ایمان کو عزیز ترین متاع سمجھنے والے لوگ ہی ہونے چاہئیں۔)

(ابو رجاء بصریؒ بیان کرتے ہیں کہ جب میں مدینہ میں داخل ہوا تو میں نے لوگوں کا ایک جم غفیر دیکھا۔ اس مجمع میں میں نے دیکھا کہ ایک آدمی ایک دوسرے آدمی کا سر چوم رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ "میں آپ پر قربان جاؤں۔ اگر آپ نہ ہوتے تو ہم ہلاک ہو جاتے۔"

میں نے پوچھا کہ "یہ دونوں بزرگ کون ہیں؟"

لوگوں نے بتایا کہ "یہ حضرت عمرؓ ہیں اور حضرت ابو بکرؓ کا سر اس خوشی میں چوم رہے ہیں کہ مرتدین آپ ہی کی بدولت زیرنگیں ہوئے اور زکوٰۃ روک لینے کے بعد دوبارہ دینے پر مجبور ہوئے۔"

ابو رجاء ایک معتبر اور ثقہ راوی ہیں اور انہوں نے ان دونوں عظیم انسانوں کی محبت اور تعظیم کا جو آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے وہ انوکھا نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ اسی بات کے سزاوار تھے کہ حضرت عمرؓ ان کی عظمت کا اعتراف اسی انداز میں کریں۔ یہ واقعہ اپنی سند کے اعتبار سے صحیح معلوم ہوتا ہے اور اگر صحیح نہیں ہے تو اس کو صحیح ہونا چاہیئے۔

اس وقت مسلمانوں کے ان دو بڑوں نے فتنۂ ارتداد کا مقابلہ جس جانکدستی اور تندہی سے کیا اس کی مثال تاریخ عالم میں ملنی مشکل ہے۔ پھر تعجب یہ ہے کہ ان دونوں کے مقصد میں اتنا ہی قرب تھا جتنا تصور کیا جا سکتا ہے لیکن دونوں کی آراء میں ابتداءً اتنا ہی اختلاف و بعد تھا جتنا دو افراد کی آراء میں ہو سکتا ہے یہ اتحاد و اتفاق بجائے خود کم تعجب خیز نہیں۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر حیرت انگیز امر یہ ہے کہ مقصد میں اتفاق اور رائے میں اختلاف ہونے کی صورت میں ظن غالب یہ تھا کہ حضرت عمرؓ اپنے فطری تقاضے کی بناء پر شدت کا پہلو اختیار کریں گے۔ اور حضرت ابوبکرؓ اپنی افتادِ مزاج کے مطابق نرمی پر مائل ہوں گے مگر واقعات نے اس گمان کو غلط ثابت کیا۔

تاریخی مطالعہ اپنے موضوع کے اعتبار سے کچھ کم اہم اور بلند نہیں۔ مگر ساتھ ہی نفسیاتی مطالعہ کی اہمیت اور بلندی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخی مطالعہ کی غرض و غایت آخر اس کے سوا کیا ہے کہ انسان کا اس کی نفسیات کی

روشنی میں جائزہ لیا جائے؟ بلکہ تاریخ ہی پر کیا انحصار ہے، دوسرے تمام علوم کی بھی آخری غرض و غایت یہی ہے۔

حضرت عمرؓ اپنے دوست سے فرماتے ہیں کہ "اے جانشین رسولؐ! لوگوں کے ساتھ رفق و نرمی برتیئے۔ آپ ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے ہوتے ہوئے کیسے جنگ کریں گے:" مجھے حکم ملا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لاالہ الا اللہ کا اقرار کرلیں۔ جس نے لاالہ الا اللہ کا اقرار کرلیا اس نے اپنی جان و مال کی امان میری طرف سے حاصل کرلی۔ یہ اور بات ہے کہ اللہ کے حق کا تقاضا اس کے برعکس ہو۔"

حضرت ابوبکرؓ نے جواب میں ارشاد فرمایا "خدا کی قسم! جو شخص نماز و زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اُس سے ضرور جنگ کروں گا۔ زکوٰۃ مال کا حق ہے۔ اگر انہوں نے اس حق کے ادا کرنے میں کوتاہی کی اور بکری کا ایک بچہ بھی دینے سے انکار کیا تو میں ان سے جنگ کروں گا۔"

(اس کے بعد برافروختہ ہو کر آپ نے بلند آواز کے ساتھ فرمایا" اے ابن خطابؓ! مجھے امید تھی کہ تم اس معاملہ میں میرا ساتھ دوگے۔ مگر تم نے کچھ اور ہی رویہ اختیار کیا۔ کیا دورِ جاہلیت کا جبّار، اسلام میں آکر بزدل ہوگیا ہے؟ اب وحی کا سلسلہ ختم ہوچکا۔ دین مکمل ہوچکا۔ کیا میرے جیتے جی اس میں قطع و برید کی جاسکتی ہے؟")

آپ نے ان دونوں ساتھیوں کے اختلاف کی نوعیت و شدت ملاحظہ فرما لی۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں، یہ اختلاف اپنی جگہ کچھ کم تعجب خیز نہیں مگر اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ یہ اختلاف جس طریق پہ سامنے آیا وہ توقع کے خلاف اور دونوں انسانوں کی افتادِ طبیعت کے برعکس تھا۔ یہاں آکر انسان کی فکر و نظر ٹھٹک کر رہ جاتی ہے اور صرف یہیں نہیں بلکہ فتنہ ارتداد سے متعلق جملہ واقعات آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پیش آنے والے تمام حالات اور قیام خلافت سے تعلق رکھنے والے سارے مسائل یکساں طور پہ انسانی فکر و نظر کی حیرانگی کا باعث ہیں۔

اس عجیب و غریب صورتِ حال کو سمجھنے کے لئے ان دو باتوں کا پیش نظر رکھنا انتہائی ضروری اور ناگزیر ہے جو اس کے پس منظر میں کام کر رہی تھیں۔

پہلی یہ کہ انسان کے روزمرہ کے اخلاق و عادات میں جو چیزیں زیرِ مشاہدہ آتی رہتی ہیں انسان صرف انہیں کا مجموعہ نہیں ہوا کرتا بلکہ اس کے اندر کچھ ایسی خصوصیات بھی مضمر و پنہاں ہوتی ہیں جو عام حالات میں ظہور پذیر نہیں ہوتیں۔

دوسری یہ کہ انسان کے روزمرہ اخلاق و عادات کا رُخ مختلف ہوتا ہے بعض کا رُخ تو آسانی سے ذہن میں آجاتا ہے اور بعض کا رُخ غور و خوض کے بعد سمجھ میں آتا ہے۔

شدت حضرت ابوبکرؓ کے مزاج میں موجود تھی۔ جو اپنے وقت پر ظاہر ہوا

کرتی تھی اور نرمی حضرت عمرؓ کی طبیعت میں بھی موجود تھی جو اپنے وقت پر ظاہر ہوا کرتی تھی۔

ان دونوں اوصاف کے ظاہر ہونے کا سب سے زیادہ موزوں اور مناسب یہی نازک موقع تھا۔ نازک مرحلے کے پیش آنے کے بعد ہی انسان اپنے نفس کا پوری طرح جائزہ لینے اور اپنے مزاج کے مخفی گوشوں تک پہنچنے پر مجبور ہوتا ہے بالآخر ایسا نتیجہ سامنے آتا ہے جو عام حالات میں ظاہر نہیں ہوا کرتا۔ پھر یا تو نرمی سختی کا روپ دھار لیتی ہے یا سختی نرمی کے لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے یا دونوں اپنی اپنی اصلی حالت ہی میں ظاہر ہوتی ہیں۔

یہ ہے وہ اصلی اور بنیادی سبب جو روزمرہ کے برخلاف ظاہر ہونے والے اخلاق و عادات کے پس منظر میں کام کرتا ہے۔

مذکورہ بالا حقیقت کو سامنے رکھئے تو یہ بات بخوبی سمجھ میں آجائے گی کہ حضرت عمرؓ نے فتنۂ ارتداد کے مسئلے میں جو موقف اختیار کیا وہ آپ کے روزمرہ اخلاق و عادات سے متضاد نہ تھا بلکہ ان کے عین مطابق تھا۔ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ انسان کے روزمرہ کے اخلاق و عادات کے مختلف رخ ہوتے ہیں جن میں سے بعض کافی غور و خوض کے بعد سمجھ میں آتے ہیں۔ اسی اصول کو سامنے رکھ کر حضرت عمرؓ کے اس موقف پر غور کیجیے۔

حضرت عمرؓ مجتہد اور صائب الرائے تھے۔

حضرت عمرؓ جو کچھ صحیح سمجھتے تھے اس کے اظہار میں بے باک تھے۔

حضرت عمرؓ راسخ العقیدہ اور محکم الایمان تھے۔

حضرت عمرؓ عادل تھے اور عدل کے لئے ہر کد و کاوش کر گذرنے والے تھے

آپ کی ان خصوصیات کو سامنے رکھ کر آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا آپ کا یہ موقف ان خصوصیات سے ہم آہنگ نہ تھا؟

کیا آپ نے یہ اظہار خیال کر کے کہ زکوٰۃ کا معاملہ بہتر اور سازگار حالات پیدا ہو جانے تک کے لئے ملتوی کر دیا جائے اجتہاد کا ثبوت نہیں دیا؟ یہاں اس سے بحث نہیں کہ آپ کی یہ اجتہادی رائے درست تھی یا نادرست۔

کیا آپ نے اپنی رائے بغیر کسی مدافعت کے ظاہر کر کے بیباکانہ اظہار خیال کا ثبوت نہیں دیا؟ کیا آپ کے اس طرح بے باکانہ اظہار رائے سے یہ نہیں ظاہر ہو گیا کہ آپ کو اسلام کے زندہ و باقی رہنے کا محکم یقین حاصل ہے؟ خواہ گمراہی کی وادیوں میں بھٹکنے والے اس کو مٹانے کے لئے کتنا ہی زور کیوں نہ صرف کر ڈالیں۔

کیا اس طرح آپ کی عادلانہ کد و کاوش نکھر کر سامنے نہیں آگئی اور دنیا نے یہ دیکھ نہیں لیا کہ جب تک قصاص کا مسئلہ اچھی طرح سمجھ میں نہ آ گیا، آپ تردد اور پس و پیش میں پڑے رہے اور جس آن اصل حقیقت روشن ہو گئی اپنے ساتھی کی رائے سے اتفاق کر لیا؟

یہ سب کچھ ہوا اور جو کچھ بھی ہوا آپ کے روزمرہ اخلاق و عادات کے عین مطابق ہوا۔ اگرچہ اس کی اصل حقیقت غور و خوض کے بعد سمجھ میں آئی۔

اب رہا حضرت ابوبکرؓ کا موقف تو یہ بھی آپ کے روزمرہ اخلاق و عادات کے بظاہر برخلاف نظر آتا ہے۔ مگر ہم اس سے پہلے جو اصول بیان کر چکے ہیں اگر اس کو سامنے رکھا جائے تو یہ ظاہری تضاد بھی باقی نہیں رہتا۔ ہم کسی انسان کو صحیح معنوں میں سمجھنے سے قاصر رہیں گے اگر اپنے ذہن میں یہ خیال راسخ کر لیں کہ وہ اپنی پوری زندگی ایک ہی ڈگر پر چلتا رہے گا۔ اور اس سے روزمرہ زندگی کے مخالف افعال کا صدور نہ ہوگا۔

نفوس انسانی ———— بالخصوص اکابر و اعاظم ———— کے مطالعہ کے وقت اگر ہم محولہ بالا اصول کو پیش نظر رکھیں تو حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کا موقف ہمیں ذرا بھی انوکھا نہ نظر آئے گا۔

اب تک کی گفتگو سے تو یہ واضح ہوگیا کہ حضرت ابوبکرؓ کا موقف سراسر دوراندیشی پر مبنی تھا۔ مگر ابھی تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ آیا حضرت عمرؓ کا موقف بالکل ہی بے وزن تھا یا اس کو اختیار کرنے کی کوئی وجہ جواز موجود تھی۔

آج ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر ہم فتنۂ ارتداد کے زمانہ میں ہوتے تو اس وقت بھی ہم وہی رائے رکھتے جو آج رکھتے ہیں اور حضرت ابوبکرؓ کی رائے سے اتفاق کرنے میں کوئی تردد نہ محسوس کرتے۔ اس لئے کہ یہ رائے عین

یہ کوئی معکوس بات نہیں

صواب اور فرض کے تقاضے سے ہم آہنگ ہے۔

ایسا اس وجہ سے ہوتا کہ آج نتیجہ ہمارے سامنے آچکا ہے۔

فرض کیجئے کہ ہم اس ماحول میں ہوتے جس میں فتنہ ارتداد پیش آیا تو کیا ہم میں ہزارہا لوگ ایسے نہ پائے جاتے جو جنگ سے گریز کرنے یا صلح کرنے کا مشورہ دیتے؟ کیا ہم میں سے بہت سے لوگ یہ مشورہ نہ دیتے کہ مرتدین کا معاملہ جیش اسامہ رض کی واپسی تک ملتوی رکھا جائے؟ اگر اس وقت تک انہوں نے صحیح راستہ اختیار کر لیا تو بہتر ورنہ پوری تیاری کے بعد ان سے نپٹ لیا جائے؟ یہ رائے رکھنے پر ہمیں یہ اندیشہ مجبور کرتا کہ اس ابتری اور خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر مکہ و مدینہ کے منافقین بغاوت نہ کر بیٹھیں اور یہ خوف بھی یہ رائے رکھنے پر مجبور کرتا کہ اگر مرتدین سے جنگ کی گئی تو کہیں ان کو کامیابی نہ ہو جائے اور یہ مصلحت بھی کہ قبائل جب تک صحرا میں ہیں اُن سے مصالحانہ گفتگو ہو سکتی ہے لیکن اگر ان کو چھیڑ دیا گیا تو ان کا مرکز کی طرف بڑھ آنا ناممکن نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ساری صورتیں ہمارے ذہن میں آتیں اور جس رائے میں اتنے گوناگوں ممکن پہلو ہوں اس کو بالکل بے وزن یا عظیم غلطی کے لفظ سے نہیں تعبیر کیا جا سکتا۔ اگرچہ واقعات سے ثابت یہی ہے کہ دوسری رائے ہی سراپا صواب تھی۔

مرتدین کے مسئلہ میں جو اختلاف رائے ہوا اُس کو مضبوط قوت فیصلہ نے

ختم کر دیا۔ اس لئے کہ محض رائے رکھنا کافی نہ تھا اور نہ اس سے آج تک تاریخ کا کوئی معرکہ آرا مسئلہ حل ہوا ہے۔

قدرت کو یہ منظور تھا کہ مرتدین کے مسئلہ میں حضرت ابو بکرؓ اکیلے ہیرو کا پارٹ ادا کریں۔ اس مسئلہ میں سارے لوگوں نے اپنی اپنی رائے و عمل اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق حصہ لیا۔ مگر جو مقام حضرت صدیقؓ کے لئے مقدر تھا وہ کسی کو میسر نہ آسکا۔ اس عظیم انسان کا عظیم سراسی بات کا سزاوار تھا کہ حضرت عمرؓ جیسا جلیل القدر انسان بھی جذبات تعظیم و تکریم سے لبریز ہو کر اس کو چوم لے اور یہ ثابت کر دے کہ میں ہی نہیں اس راس جلیل کو بوسہ دے رہا ہوں بلکہ تمام مسلمانوں کے ہونٹ میرے ہونٹ کے ساتھ شریک بوسہ ہیں۔

اس ساری تفصیل میں درس و عبرت کا پہلو ایک مورخ یا ماہر نفسیات کی نگاہ میں وہ بنیادی جوہر ہے جو اسلامی دعوت کے آغاز میں موجود تھا — وہ اسلامی دعوت جس کے ہر منظر پر ہزاروں ہیرو اپنا اپنا کام کرتے نظر آتے ہیں۔ ہر ہیرو کا پارٹ جداگانہ ہے اور ہر ایک اپنا پارٹ بڑی حسن و خوبی سے نباہ رہا ہے۔ پھر سب سے بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ ان سب میں تعاون و اخلاص کی اعلیٰ اسپرٹ بھی موجود ہے۔

فتنۂ ارتداد ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ تاریخ اسلام میں ایک نئے مرحلے کا آغاز ہو گیا جو پہلے مرحلے سے بھی زیادہ اہم اور عظیم تھا۔ حضرت صدیقؓ اس

مرحلہ سے بھی اسی عزم وارادہ کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے جس عزم وارادہ کے
ساتھ ہر کام کو نباہنا آپ کا طبعی خاصہ تھا۔
پہلا مرحلہ تو اسلام کو اس کے اپنے گھر میں زندہ و باقی رکھنے کا تھا۔
دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ اسلام کی سرحدوں کو محفوظ و مستحکم کر دیا جائے تاکہ
بیرونی حملوں کا اندیشہ باقی نہ رہے۔
ہم نے سرحدوں کی حفاظت کی تعبیر قصداً اختیار کی ہے اور اس لئے
کی ہے کہ حضرت صدیقؓ نے جو فوجی دستے عراق و شام کی سرحدوں کی طرف
روانہ فرمائے۔ وہ محض حفاظت کی غرض سے غلبہ و تسلط کے ارادے سے نہیں
آپ نے اپنی خارجہ پالیسی اسی پالیسی سے ہم آہنگ رکھی جو آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے اختیار کر رکھی تھی۔ اس پالیسی کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ جارحانہ نہ
تھی بلکہ اس کی غرض و غایت صرف یہ تھی کہ دشمنوں کی جارحانہ کارروائیوں کی
مدافعت کی جائے۔ قافلوں کی گذرگاہوں میں امن وامان برقرار رکھا جائے
اور دلیل و برہان سے باحسن طریق دین کی ترویج و اشاعت کے لئے راستہ
ہموار کیا جائے۔ اور اگر امن پسندانہ تبلیغ کی راہ میں کوئی ظالم و جابر طاقت
روڑے اٹکائے تو اس کی ذمہ داری خود اس پر ہو۔
غزوہ تبوک میں ــــــــ جیسا کہ ہم عبقریت محمدؐ میں بیان کر چکے ہیں
ــــــــ اسلامی لشکر کو جب یہ یقین ہو گیا کہ رومی واپس چلے گئے

اور اب وہ اس سال جنگ نہیں کر سکتے تو وہ خود بھی واپس لوٹ آیا۔ اس غزوہ کا پس منظر یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع پہنچی کہ رومی فوجیں عربی سرحدوں پر جمع ہو کر حملے کی تیاری کر رہی ہیں۔ یہ خبر ملتے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی فوج ترتیب دی اور مقابلے کے لئے پیش قدمی فرماتے ہوئے مقام تبوک تک پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر یہ معلوم ہوا کہ رومیوں نے جنگ کا ارادہ اب ترک کر دیا ہے۔ چنانچہ اسلامی فوج بھی باوجود طول طویل سفر کی مشقتیں برداشت کرنے اور زبردست مالی اخراجات کا بار اٹھانے کے مقام تبوک ہی سے واپس چلی آئی۔

یا جیسا کہ ہم "عبقریت عمرؓ" میں بتا چکے ہیں کہ دولت روما جزیرہ نما ئے عرب کے سرحدی قبائل کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کے لئے اپنے وفود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے ہی مسلسل بھیجتی رہی تھی۔ مسلمان اس حکومت کی طرف سے دائمی خطرے میں تھے۔ اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کی اس گفتگو سے کیا جا سکتا ہے جو ازواج مطہرات سے متعلق ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ خبر ملتی رہتی تھی کہ غسان ہم سے جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ میرا ساتھی اپنی باری کے دن نیچے گیا اور عشاء کے وقت واپس آکر دروازے پر زور کی دستک دی اور گھبراہٹ بھرے لہجہ میں آواز دی کہ میں کہاں ہوں۔ میں خود بھی گھبرا کر باہر آ گیا۔ اُس نے کہا۔ بڑا حادثہ ہو گیا۔ میں نے

کہا، کیا ہوا؟ کیا غسانی آگئے؟ اُس نے کہا کہ نہیں! بلکہ اس سے بھی بڑا اور اہم واقعہ ہو گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج کو طلاق دے دی ہے۔"

یہ مختصر گفتگو اس خوف و اندیشہ کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہے، جو عربوں کو رومیوں کی جانب سے ہر وقت لاحق رہتا تھا۔

حضرت صدیقؓ نے منصب خلافت سنبھالتے ہی بلا تاخیر جیش اسامہؓ کی روانگی کا انتظام کیا تاکہ ان قبائل کو قابو میں رکھا جائے جنہوں نے حجاز و شام کی گذرگاہوں میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اور اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ان کے دلوں پر اسلام کی ہیبت و دبدبہ کا سکہ جم جائے۔ اس لشکر کی حیثیت موجودہ دور کی اصطلاح کے مطابق "ایک" وہی مہم یا کارروائی کی سی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے اس دائرے سے ایک انچ بھی تجاوز نہ کیا اور بعض مورخین کے بیان کے مطابق چالیس دن میں اور بعض دوسرے مورخین کی روایت کے مطابق ستّر دن کے اندر اندر اپنا کام ختم کر کے مدینہ منورہ واپس آگیا۔

ایران کی سرحدوں پر جو لڑائیاں بحرین وغیرہ کے علاقہ میں ہوئیں وہ فتنہ ارتداد کے جنگی سلسلہ کی ایک کڑی تھیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جو قبائل ایران کے زیر تسلط تھے، مسلمانوں کے علاقوں میں گھس آیا کرتے اور قتل و غارت کا بازار

گرم کرنے کے بعد واپس چلے جاتے مسلمان ان کی مدافعت کرتے، ان سے بدلہ لیتے اور ان کی سرحدوں تک ان کا پیچھا کرتے۔ حدود مملکت میں اس وقت جو عام افراتفری پھیلی ہوئی تھی اس کے باعث حضرت ابو بکرؓ کو ابتداءً اس کمانڈر کا نام تک نہ معلوم تھا جس کی زیر امارت مسلمان اس علاقے میں مدافعت کا فرض انجام دے رہے تھے۔ چنانچہ آپ نے سرحدی واقعات کی اطلاع ملنے پر لوگوں سے حیرت و استعجاب بھرے لہجے میں پوچھا کہ "یہ کون شخص ہے جس کے کارناموں کی اطلاعات ہمیں پیہم مل رہی ہیں اور ہم اس کے نام و نسب تک سے واقف نہیں ہیں۔"

عاصم بن قیس نے بتایا "یہ کوئی گمنام، مجہول النسب اور کم درجہ انسان نہیں ہے۔ یہ مثنیٰ بن حارثہ شیبانی ہیں۔"

یوں آغاز ہوا اس جنگ کا جو عرب مسلمانوں اور ایرانیوں اور ان کے زیر اثر بحرین و سواد کے قبائل کے مابین ہوئی۔ اور اس کا اختتام عرب و ایران کی مشہور عالم جنگ پر ہوا۔

حضرت صدیقؓ نے حضرت خالدؓ کو مثنیٰؓ کی مدد کے لئے بھیجا اور ان کو ہدایت فرمائی کہ "وہ اہلِ ایران اور ان کے زیر اثر قوموں کے ساتھ نرم برتاؤ کریں۔" چنانچہ حضرت خالدؓ نے اس ہدایت کے مطابق پیش قدمی فرمائی۔ گذرگاہوں میں امن و امان قائم کیا اور اہل حیرہ وغیرہم سے اس شرط پر صلح کی کہ وہ آئندہ مسلمانوں

کی مخالفت نہ کریں گے۔ عرب و عجم سے تعلق رکھنے والے کسی مسلمان کے خلاف کسی کافر کی مدد نہ کریں گے۔ مسلمانوں کے راز دشمنوں کو نہ بتائیں گے۔ اگر انہوں نے عہد شکنی کی تو پھر کوئی ذمہ داری اور امان نہیں۔ اگر عہد کو برقرار رکھا اور اس کی نگہداشت کی تو اُن کو وہی حقوق دیئے جائیں گے جو معاہدہ کرنے والوں کو دیئے جاتے ہیں اور مسلمان ان کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔ جس آدمی کے جسم پر وردی پائی جائے گی اُس سے جواب طلبی کی جائے گی۔ اگر اُس کے پاس معقول جواب ہوا تو خیر ورنہ سزا دی جائے گی۔"

(ایرانیوں کے چھاپہ مار دستوں کے مطالعہ سے ایک مؤرخ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ حالات نے خلیفہ اول کو ایرانیوں سے جنگ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود آپ نے یہ بات فراموش نہ کی کہ ان علاقوں میں آباد قوموں کے ساتھ نرم سلوک کیا جائے۔ امراء اور رؤساء کے ساتھ صلح کا رویہ اختیار کیا جائے۔ اور ان کو سلامتی اور اسلام کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ آپ نے اس مہم کے لئے اس شخص کو منتخب کیا جو ان کے ساتھ اس دین کے مزاج کے مطابق برتاؤ کرے جس کی طرف ان کو دعوت دی جا رہی ہے۔ اگر وہ اس دین کو قبول کر لیں تو نہ ان سے کوئی جنگ ہے اور نہ دشمنی بلکہ وہ دینی بھائی ہیں۔ اور اگر تلوار لے کر سامنے آئیں تو ان کے جواب میں بھی تلوار ہے۔

اس طرح گویا خلیفہ اوّل کے حق میں یہ مقدّر ہو چکا تھا کہ آپ کے ہاتھوں

اسلام کی نوزائیدہ مملکت اپنی داخلہ اور خارجہ سیاست میں مستحکم و استوار ہو جائے
آپ نے جو کچھ بھی کیا اُس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پالیسی کی حرف بحرف
پیروی کی۔ بعد میں آنے والوں نے جو کچھ کیا وہ اسی مبارک آغاز کی ارتقائی
کڑی تھی۔

خدا کو یہ بھی منظور تھا کہ آپ اپنی رائے کے صحیح نتائج بچشم خود مشاہدہ کریں
یہ وہ شرف ہے جو عظیم الشان سلطنتوں کے بانیوں اور فاتحوں میں سے کم ہی کو نصیب
ہوتا ہے۔ بالخصوص ان کو جو عمر رسیدہ ہو چکے ہوں۔ آپ نے اپنی رائے کا
صائب ہونا ان واقعات میں بھی دیکھ لیا جو پایہ تکمیل کو پہنچ چکے تھے اور ان
واقعات میں بھی جو ابھی تکمیلی مراحل طے کر رہے تھے۔ آپ اس دار فانی سے رخصت
ہوتے نوید یقین ساتھ لئے ہوئے کہ جس طرح جنگ ارتداد کامیابی سے ہم کنار ہو
چکی ہے اسی طرح جنگ ایران بھی کامیابی ہی پر اختتام پذیر ہو گی۔ ان دونوں
جنگوں میں اقدامی صلاحیت اور قوتِ ایمان دونوں چیزیں ابھری نظر آتی
ہیں۔

جو شخص حضرت صدیق کے مناقب و محاسن صفحات تاریخ پر منتقل کر رہا
ہو اور آپ کی زندگی میں پیش آنے والے حالات کا تجزیہ کر رہا ہو۔ اس کے ذہن
میں یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ آپ کی اس ایمانی قوت کا منبع و سرچشمہ کیا تھا؟
آپ نے عرب کے سرکش اور باغی قبائل کو مطیع فرمان بنانے کے لئے

فوجی دستے روانہ فرمائے۔ حالانکہ آپ کے پاس جو فوج تھی وہ باغی قبائل کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھی۔

آپ نے روم وایران کی سرحدوں پر بھی فوجیں بھیجیں۔ حالانکہ آپ کے پاس عرب مسلمانوں کے علاوہ کوئی طاقت نہ تھی۔ اور ان میں بھی وہ مسلمان مستثنیٰ تھے جنہوں نے ارتداد کے بعد دوبارہ اسلام قبول کیا۔

کیا یہ محض اتفاقی امر تھا؟

کیا یہ محض اندھا بہرا ایمان تھا جو فکر و تدبّر سے خالی تھا؟ حالانکہ اسلام میں جہاں ایمان مطلوب ہے وہیں تدبّر و تفکر بھی ناگزیر ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یقین و اذعان ہی وہ بڑا سرمایہ تھا جس کے سہارے حضرت ابوبکرؓ نے فتنۂ ارتداد اور روم و ایران کی مہمات سر انجام دیں۔

اس میں بھی شک نہیں کہ آپ نے ارتداد کے بعد اسلام اختیار کرنے والوں کو ان فوجوں میں شامل نہیں ہونے دیا جو جزیرہ کی دونوں بڑی حکومتوں کی سرحدوں پر روانہ کی جا رہی تھیں۔ اس لئے کہ آپ کو یہ یقین تھا کہ ان فوجوں کا سرمایہ وہ ایمان ہے جو متزلزل اور کرم خوردہ نہیں ہو سکتا۔

اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ حضرت صدیقؓ کو اسلام کے غلبہ کا اتنا ہی یقین و اذعان تھا جتنا قوی اور مضبوط یقین کسی دل میں جاگزیں ہو سکتا ہے۔

قرآن کا ہر وعدہ آپ کی نگاہ میں عینی حقیقت سے بھی زیادہ قابل یقین

تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سنی ہوئی ہر پیشین گوئی آپ کی نگاہ میں محسوس حقیقت سے بھی زیادہ اونچا مقام رکھتی تھی۔

جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی کہ رومی چند سالوں کے اندر ایرانیوں پر غالب آجائیں گے تو حضرت صدیقؓ مشرکین قریش کے پاس گئے تاکہ ان کو اس قریبی فتح کی خبر سنا کر کڑھن اور گھٹن میں مبتلا کر دیں۔ مشرکین کو ہر اہل کتاب قوم سے نفرت تھی اور ان کی خواہش یہ ہوا کرتی تھی کہ ایرانی اہل کتاب اقوام پر غالب رہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ عربوں اور ایرانیوں دونوں کے یہاں بت پرستی مشترک تھی۔

حضرت صدیقؓ نے اُن سے فرمایا کہ "روم ایران پر غلبہ حاصل کرے گا۔ یہ بات ہمیں ہمارے نبیؐ نے بتائی ہے۔"

ابی بن خلف جمحی نے یہ سن کر بآوازِ بلند کہا "تم جھوٹ کہتے ہو۔ اے ابوالفصیل"

حضرت صدیقؓ نے جواب دیا "تو جھوٹوں کا جھوٹا ہے۔ اے دشمن خدا!"

اس پر ابی نے طیش میں آکر دس اونٹوں کی شرط بدی۔ آپ نے اس کے جواب میں سو اونٹوں کی شرط لگا دی۔ قرآن کا وعدہ آپ کی نگاہ میں عینی حقیقت سے بھی زیادہ سچا تھا۔

مشرکین کے جاسوس سراقہ بن جعشم کے متعلق آپ نے آنحضورؐ کی زبان مبارک سے یہ کہتے سنا تھا کہ "جب تم کسریٰ کے دونوں کنگن اپنے دونوں ہاتھوں

میں پہنچو گے تو تمہارا مقام کتنا اونچا ہو گا۔"

اس حدیث کی روشنی میں حضرت صدیقؓ کو یہ یقین تھا کہ اسلام کسی نہ کسی دن اکاسرۂ ایران پر ضرور غالب آئے گا۔ اور یہ کسی نہ کسی وقت دوسرے تمام ادیان پر فتح پائے گا۔ اس لئے کہ قرآن کریم اور رسول امینؐ کی پیشین گوئی جھوٹی ثابت نہیں ہو سکتی۔

ان تمام امور میں سے کسی امر میں بھی حضرت صدیقؓ کو ایک لمحہ کے لئے شک نہیں گذرا۔ اسلام تمام ادیان پر غالب ہو گا، یہ بات آپ کی نگاہ میں عینی اور چشم دید حقیقت تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ یقین۔

اس یقین و ایمان کے ساتھ ساتھ فکر و تدبر بھی از بس ضروری تھا۔

ہمارا خیال ہے کہ خلیفہ اوّل اتنے ہی بڑے مفکر اور مدبر بھی تھے جتنے عظیم مومن اور صاحب یقین تھے۔ آپ ان لوگوں میں سے نہ تھے جو حزم و احتیاط کی ضرورت ہونے کے باوجود اس سے غفلت برتتے ہیں۔ بلکہ اس کا التزام آپ اتنا ہی ضروری خیال فرماتے تھے جتنا التزام کسی بھی اہم چیز کا کیا جا سکتا ہے آپ کے حزم و احتیاط اور فکر و تدبر کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جب آپ نے مرتدین سے جنگ کرنے کا عزم بالجزم کر لیا تو فوج کو حکم فرمایا کہ وہ مدینہ کی حفاظت و نگرانی کی غرض سے رات مسجد میں گذارے تاکہ ہنگامی ضرورت پیش آنے پر اس کو فوراً طلب کیا جا سکے۔

پھر آپ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو مہم پر روانہ کرتے وقت جو وصیت فرمائی وہ بھی فکر و تدبر اور حزم و احتیاط کا ایک شاہکار ہے حضرت خالدؓ جس قدر غیر معمولی جنگی بصیرت اپنے اندر رکھتے تھے وہ ڈھکی چھپی نہیں مگر اس کے باوجود آپ نے ان کو روانہ کرتے وقت پند و نصیحت کرنا ضروری سمجھا۔ یہ مختصر جامع اور ٹھوس نصیحت جو فکر و تدبر، حزم و احتیاط اور بیدار مغزی کا مرقع ہے یہ ہے۔ آپ نے فرمایا۔

"جب دشمن کی سرزمین میں قدم رکھنا تو خود حملہ نہ کرنا ورنہ جوابی حملہ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہمیشہ عام لوگوں کی مدد سے غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ دلیل راہ کو ساتھ لے کر چلنا طلیعہ کو آگے بھیجنا تاکہ وہ آگے مناسب جگہ پر تمہاری فرودگاہ کا انتظام کر سکے۔ ہمیشہ منظم ہو کر کوچ کرنا۔ موت سے محبت کرنا تو زندگی عطا کی جائے گی شب خون سے چوکنے رہنا کیونکہ یہ عربوں کی معروف عادت ہے۔ جب اسد اور غطفان سے ملو گے تو کچھ لوگ تمہارے موافق ہوں گے اور کچھ مخالف اور کچھ غیر جانبدار۔ آخر الذکر گروہ اس کے ساتھ ہولے گا جس کا غلبہ ہوگا۔ مجھے اندیشہ اگر ہے تو اہل یمامہ کی طرف سے۔ اللہ کا نام لے کر ان سے جنگ کرو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ سب کے سب مرتد ہو چکے ہیں۔ اہل بادیہ سے فارغ ہونے کے بعد فوراً یمامہ

کا رخ کرنا۔ خدا حافظ!"

اس وصیت سے بھی زیادہ حزم واحتیاط اور تدبر اس وصیت سے مترشح ہوتا ہے جو آپ نے فتوحات شام کے وقت یزید بن ابی سفیان کو فرمائی۔ ملاحظہ ہو

"جب دشمن کے قاصد تمہارے پاس آئیں تو ان کے ساتھ تعظیم و تکریم سے پیش آؤ۔ ان کو اپنے اندر ٹھہرنے کا کم سے کم موقع دو تا کہ وہ تمہارے لشکر کے متعلق کچھ معلومات حاصل نہ کر سکیں۔ ان کو زیادہ دیر تک اپنے درمیان نہ ٹھہرانا کہ کہیں وہ تمہارے اندرونی رازوں سے واقف نہ ہو جائیں۔ ان کو اپنے لشکر کے گنجان اور پرشکوہ حصے میں ٹھہراؤ اور عام لوگوں کو ان سے ملنے ملانے کا موقع نہ دو۔ تم خود ہی ان سے گفتگو کرو اور گفتگو میں حزم و احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دو کہ تمہاری پوزیشن ان کی نگاہوں میں مشکوک نہ ہو جائے جاسوسوں اور چوکیداروں کی بھاری تعداد فوج کے مختلف حصوں میں پھیلائے رکھو اور ان کی بے خبری میں اچانک ان کی چوکیوں کی جانچ پڑتال کرتے رہو۔ جس کو اپنے فرض سے غافل پاؤ اس کی نرم اور بہتر طریق پر تادیب کرو۔ رات کے وقت ہر ایک کی باریاں مقرر کرو اور پہلی باری دوسری باری سے طویل ہو۔ کیونکہ دن سے قریب ہونے کے باعث اس کی ادائیگی آسان ہوتی ہے۔"

آپ اگر اپنی فوج اور اجنبی فوج کے ساز و سامان میں نمایاں تفاوت محسوس فرماتے تو اس تفاوت کو پورے اہتمام ہی کے ساتھ دور فرمانے کی کوشش کرتے فوج شام کی مہم پر روانہ ہونے والی تھی جب آپ نے اس کا معائنہ فرمایا تو اس سپاہ اور ساز و سامان کی کمی کچھ پسند نہ آئی۔ اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے سوال فرمایا "اس قلیل ساز و سامان کے ساتھ اس فوج کو شام روانہ کرنے کے بارے میں تم لوگ کیا مشورہ دیتے ہو"

حضرت عمرؓ نے فرمایا "شام کے ٹڈی دلوں کے مقابلہ میں یہ بے سر و سامانی مجھے پسند نہیں۔"

دوسرے لوگوں نے بھی حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید کی۔ چنانچہ آپ نے یمن کو بھی جہاد کی تیاری کا حکم دیا تاکہ یہ کمی دور ہو جائے۔

جس انسان نے قبائل کی بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیے فوجیں بھیجتے وقت ادنیٰ فرو گذاشت نہیں کی جس نے امیر لشکر کے انتخاب میں حسن انتخاب کا حق ادا کر دیا۔ جس نے قائد جیش کو جو گنتا رہنے کی بار بار تاکید کی۔ جس نے شام روانہ والی فوج کی بے سرو سامانی گوارا نہ کی اور جس نے یہ ساری تدبیریں اپنے گھر میں بیٹھے بیٹھے انجام دیں۔ اس کے متعلق یہ رائے قائم کرنا کہ اس نے ایران کی سرحدوں پر فوجیں بھیج دی ہوں گی اور اس معاملہ میں اپنے معروف فکر و تدبر سے کام نہ لیا ہوگا، ایک فاش غلطی کے سوا کچھ نہیں۔

آپ جہاں یہ ایمان رکھتے تھے کہ قلیل جماعت کثیر جماعت پر غالب آئے گی اس لئے کہ ایمان کی طاقت ہی آپ کی نگاہ میں اصل طاقت تھی، وہیں آپ فکر و تدبر اور حزم و احتیاط کو بھی جزوِ ایمان سمجھتے تھے۔

یزید بن ابی سفیان سے فرمایا "ہماری چھوٹی جماعت خدا کے حکم سے دشمنوں کی بھاری تعداد پر غالب رہے گی۔ مزید برآں میں تمہاری مدد کے لئے مسلسل آدمی بھیجتا رہوں گا یہاں تک کہ تم خود مکتفی اور مزید آدمیوں کی حاجت سے بے نیاز ہو جاؤ گے۔"

آج ہم یہ جانتے ہیں کہ حضرت صدیقؓ نے روم و ایران کی طرف جو فوجیں روانہ فرمائیں وہ مظفر و منصور واپس آئیں اور دشمن ناکام و نامراد ہوئے۔

آج ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ایرانی عربوں سے ایک ایسی حکومت کو بچانا چاہتے تھے جس کا شیرازہ خارجی جنگوں اور داخلی فتنوں کے باعث بکھر چکا تھا اس قوم کے سینوں میں دہکنے والے آتشکدے اس کے خارجی آتش کدوں سے پہلے ہی سرد ہو چکے تھے۔ اور اس کے کمانڈر اور امرائے جیش اس حد تک ناکارہ ہو چکے تھے کہ بُرے بھلے کی تمیز اُن کو نہ رہی تھی۔

آج ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ رومی اس لئے شکست کھا گئے کہ وہ عربوں سے ایسی حکومت محفوظ رکھنا چاہتے تھے جو خارجی جنگوں اور داخلی فتنوں کی آماجگاہ بن چکی تھی اور جس کی چُول چُول ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ لاحاصل مناظرہ بازی اور بے

سود لڑائیوں نے اس قوم کے مذہبی عقائد کو دلوں کی بوسیدہ اور فرسودہ میراث بنا کر رکھ دیا تھا۔ حکومت اس حد تک گر چکی تھی کہ ہون اور اتارہ کے قبائل نے بھی اس سے خراج وصول کیا اور اس نے بخوشی ادا کیا۔ حدود مملکت میں ایسی قومیں آباد تھیں جو اس کی بدخواہ اور اس کی تباہی کی منتظر تھیں اور رفتہ رفتہ نوبت بایں جا رسید کہ میدانِ جنگ میں سپاہیوں کو بھاگ جانے کے ڈر سے ایک دوسرے کے ساتھ زنجیروں سے باندھ دیا جاتا۔

یہ ساری باتیں آج ہم اس لئے جانتے ہیں کہ یہ واقعاتی صورت میں ہو چکی اور ان کے ہونے میں کوئی شک نہیں۔ تاریخ کے صفحات ہمارے سامنے کھلے پڑے ہیں اور کوئی حجاب باقی نہیں رہا ہے۔

حضرت صدیقؓ کے سامنے یہ نتائج واقعات کی صورت میں اس طرح نہیں تھے جس طرح آج ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اور آپ کو تاریخ سے رسائی طرح میسر نہیں تھی جس طرح آج ہمیں میسر ہے۔

یہ صحیح ہے کہ یہ نتائج مستقبل کی تاریکی میں تھے مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا نہیں کہ آپ نے جو کچھ کیا فکر و تدبر اور حزم و احتیاط اختیار کئے بغیر ہی کیا اتفاقات نے آپ کا ساتھ دیا۔ یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں بلکہ صحیح یہ ہے کہ پر یہ سارے حقائق روز روشن کی طرح عیاں تھے۔

آپ جانتے تھے کہ ایرانی اسلام سے بھی پہلے جنگ ذی قار میں عربوں

ہاتھوں شکست کھا چکے ہیں۔ حالانکہ اس وقت عربوں اور ایرانیوں کی قوت وطاقت میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

آپ یہ بھی جانتے تھے کہ رومیوں کے اندر بھی اب کچھ کس بل باقی نہیں رہا ہے اور وہ ہمت ہار چکے ہیں۔ اس لئے کہ عربوں کے دو فوجی دستوں نے ان کی سرحدوں پر کھلے بندوں چھاپا مارا اور وہ کچھ نہ بگاڑ سکے۔

آپ یہ بھی جانتے تھے کہ عربوں سے اگر دین کے نام پر اپیل کی گئی جب بھی وہ اخلاص و پامردی کا ثبوت دیں گے اور اگر محض دنیا کے نام پر دعوت دی گئی تب بھی وہ پیچھے ہٹنے والے نہیں۔ فتح و نصرت کا جو وعدہ ان سے کیا گیا ہے اس کی صداقت پر یہ دل کی گہرائیوں کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں۔ موت سے اسی طرح محبت کرتے ہیں جس طرح دشمن زندگی کو عزیز سمجھتے ہیں۔ جفاکش لوگ ہیں اور بے سرو سامانی کی پرواہ نہیں کرتے۔ پیچھے سے وسیع و عریض صحرا ان کا محافظ ہے۔ اگر پسپائی کی ضرورت پڑی تو پیچھے دور دراز تک کوئی شے حائل ہونے والی نہیں۔ جو جس سرزمین پر چڑھائی کر رہے ہیں، عرب مخبر یا رہنما اس کے چپے چپے سے واقف ہیں۔ ان کے لئے راستہ چلنا کچھ دشوار نہیں۔ اور سب پر مستزاد یہ کہ یہ سرزمین اندرونی فتنہ و فساد اور انتشار و اضطراب کی آماجگاہ بن چکی ہے۔ اس لئے اس پر غلبہ حاصل کر لینا چنداں مشکل نہیں۔

یہ وہ حقائق ہیں جو حضرت صدیق کی نگاہوں سے اوجھل نہ تھے اور یہ اس

بات کی روشن دلیل ہیں کہ ایمان کے ساتھ جتنا فکر و تدبر درکار تھا اُس سے زیادہ
آپ کے اندر موجود تھا۔

یہ تمام زرّیں کارنامے آپ نے تین سال سے بھی کم مدّت میں سرانجام دیئے
(1) اسی قلیل مدّت میں آپ نے اسامہؓ کی مہم روانہ کی حالانکہ یہ جتنی پُرخطر تھی کسی
سے مخفی نہیں۔ (2) اسی قلیل مدّت میں فتنۂ ارتداد کی سرکوبی کی حالانکہ یہ بھی خطرات
سے گھرا ہوا معرکہ تھا۔ (3) اسی قلیل مدت میں روم و ایران کی سرحدوں پر چڑھائی
کی حالانکہ ان کی سطوت و جبروت کا چار دانگ عالم میں چرچا تھا۔

یہ تینوں واقعات دولت اسلامیہ کے لیئے تین ستونوں کی حیثیت رکھتے ہیں
ان میں سے اگر ایک ستون بھی سیدھا نہ ہو پاتا تو یہ پوری عمارت پیوندِ خاک
کر رہ جاتی۔ اگر یہ تینوں واقعات تین سال کی قلیل مدت کی بجائے تئیس سال
میں بھی انجام پاتے جب بھی ان کا انجام دینے والا تعریف و توصیف اور تحسین
و آفرین کا مستحق ہوتا۔

حضرت صدیقؓ کے عہد میں یہ موقع نہ ملا کہ اسلامی حکومت کا نظام ان سیاسی
اور انتظامی خطوط پر استوار کر دیا جاتا جن پر دنیا کی بڑی حکومتیں نوزائیدگی کے
وقت قائم کی جاتی ہیں۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ اس عہد میں وقت کی وسعت اور
تنگی کا سوال نہیں تھا بلکہ اس قسم کے نظم و نسق کی ضرورت و عدم ضرورت پر اس
مسئلے کا انحصار تھا۔ خلیفۂ اول کے عہد خلافت میں دولت اسلامیہ کے انتظامی

امور و معاملات میں کچھ اتنی نمایاں تبدیلیاں اور تغیرات واقع نہیں ہو چکے تھے کہ اس نظم و نسق کی جگہ کوئی نیا انتظامی ڈھانچہ لانے کی ضرورت پیش آتی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعید میں رائج ہو چکا تھا۔ جزیرہ نمائے عرب کا اکثر حصہ فتنۂ ارتداد کے باعث دوبارہ اسی مقام پر پہنچ گیا تھا جس مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھا۔ اور توبہ کے بعد اس کی حالت نومسلموں سے مختلف نہ تھی۔ بنابریں نظم و نسق کا جو ڈھانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے چلا آرہا تھا خلافت اولیٰ کے زمانے میں بھی وہ پوری طرح قابل عمل تھا۔ اور اس میں کسی تبدیلی یا ترمیم کی ضرورت نہ تھی۔

یہیں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حکمت روشن ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ آپ نے پہلی خلافت کیوں ایسے شخص کے سپرد کرنے کا فیصلہ فرمایا، جو عہد نبوی کی حرف بحرف پیروی کرنے والا تھا۔ یہاں تک کہ جب ضروریات و معاملات نے وسعت اختیار کر لی اور اجتہاد و تصرف کا وقت آگیا تو وقت نے خود اس شخص کو منتخب کر لیا جو اس صلاحیت سے پوری طرح متصف تھا۔ گویا وہ شخص اس وقت کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا جو وقت خود اس شخص کا منتظر اور اس کی آمد کے لئے چشم براہ تھا۔ یہ شخصیت حضرت عمرؓ کے علاوہ اور کون ہو سکتی تھی؟ جیسا کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس فرمان کے ذریعہ یہ تعین کر دیا تھا کہ:۔

"مجھے خواب میں نظر آیا ہے کہ میں ایک کنویں کی چرخی کے ذریعہ ڈول بھر بھر کر پانی نکال رہا ہوں۔ اس کے بعد ابو بکرؓ آیا اور مشکل ایک یا دو ڈول کھینچ کر بس کر دیا۔ خدا اس پر رحم کرے! پھر عمرؓ آیا اور وہ ڈول اور کشادہ ہو گیا۔ میں نے کسی مرد کامل کو اتنی جانفشانی سے کام کرتے نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ لوگ پوری طرح سیراب ہو گئے اور اونٹ بھی اطمینان سے ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئے۔"

اوپر کی تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں بہت کچھ نظم و نسق کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے صرف مکہ و مدینہ اور عرب کے عمومی مسائل و معاملات کے انتظام و انصرام ہی تک اپنی کوششوں کو محدود رکھا محض اتنی ترمیم فرمائی کہ تقسیم عمل کے اصول پر چند بھاری بھاری ذمہ داریاں مختلف اکابر کے سپرد فرما دیں۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کوئی واحد مرجع اعلیٰ ایسا موجود نہ تھا جو سارے کاموں کو بغیر دوسروں کا سہارا لئے انجام دے سکتا۔

(چنانچہ بیت المال کی ذمہ داری اس شخص کے سپرد کی گئی جس کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امینِ اُمت کے لقب سے نوازا تھا۔ اور وہ حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح تھے۔ قضا کے منصب پر اس شخص کو مامور کیا گیا جس کے عدل اور انصاف کے سامنے کسی اور کا ستارۂ شہرت چمک نہ سکا اور وہ حضرت عمرؓ

بن خطاب تھے۔ سیکریٹری جنرل یا کتابت کا عہدہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب خاص حضرت زیدؓ نے سنبھالا۔ یہ تمام عہدے اس نوعیت کے حامل نہ تھے جس نوعیت کے سرکاری عہدے آج ہوا کرتے ہیں یا خود اس دور کے بعد ہوئے۔ ان عہدیداروں کا نہ کوئی باقاعدہ دفتر تھا اور نہ متعین اوقات کار بلکہ جب ضرورت پیش آئی اپنا فرض انجام دے دیا اور پھر اپنے روزمرہ کے کاموں میں لگ گئے۔

امراء جیش جب نئے علاقے فتح کرتے تو وہاں وہ حکام اور قضاۃ کا نظم و نسق اسی طرز پر قائم کرتے جس کے وہ خود اپنے ملک میں عادی تھے۔ اگر کسی غیر ملک میں کوئی انتظامی مشکل پیش آتی تو اس کا نظم و نسق سابقہ روش پر باقی رہنے دیا جاتا مگر یہ لحاظ رکھا جاتا کہ ایسا کرنے میں دین کے کسی اصول کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شخص کو جس منصب پر مامور فرما دیا تھا حضرت صدیقؓ نے بھی اس کو اسی پر برقرار رکھا۔ اگر کوئی خود اپنا عہدہ چھوڑ کر علیحدہ ہو گیا تو دوبارہ اس کو اسی عہدے پر مامور کیا۔ اور اگر کسی کو اس کے منصب سے ہٹا کر اس کے سپرد کوئی دوسری ذمہ داری کرنا چاہی تو اس سے باقاعدہ اس کی اجازت چاہی چنانچہ عمرو بن عاص کو لکھا کہ

"میں نے تم کو وہی منصب دیا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مامور فرمایا تھا اور جس کے لئے دوبارہ بھی تمہیں کو نامزد فرما دیا تھا۔

تم کو عمان آنحضرتؐ کی اسی دوسری نامزدگی کے ایفاد کے لئے بھیجا جا رہا ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں تم کو ایسے کام پر لگاؤں جو تمہاری زندگی اور آخرت دونوں کے لئے مفید ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ تم اس منصب کو قبول کرنے پر رضامند نہ ہو۔"

حضرت عمرؓ بن خطاب نے حضرت خالد کو معزول کر دینے کا مشورہ دیا۔ الزام یہ تھا کہ انہوں نے مالک بن نویرہ کو بغیر کسی معقول وجہ کے قتل کر دیا اور اس کی بیوی سے میدانِ جنگ ہی میں شادی بھی کر لی۔ یہ ایسی بات تھی جس کو عرب جاہلیت اور اسلام دونوں ادوار میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ حضرت فاروقؓ اور حضرت صدیقؓ کی آراء اس مسئلہ میں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ اس اختلافِ رائے کی اصل وجہ یہ تھی کہ دونوں حضرات کی افتادِ طبع ایک دوسرے سے مختلف تھی اور دونوں کے یہاں چیزوں اور آدمیوں کو ناپنے کے پیمانے جدا جدا تھے۔ فاروقی مزاج اس بات کا طالب تھا کہ مجرم خواہ کوئی ہو اس کو فی الواقعی سزا ملنی چاہیے۔ اور صدیقی مزاج اس بات کا متقاضی تھا کہ حتی الوسع نرمی برتنی چاہیے اور بغیر کسی سابق نظیر کے کسی نئی چیز کا آغاز نہیں کرنا چاہیے۔ پھر حضرت خالدؓ کو ان کے منصب پر برقرار رکھنے کی ایک مثال خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت تھی۔ حضرت خالدؓ نے بنی خذیمہ کے قیدیوں کو قتل کرنے میں بھی ایسی ہی جلد بازی دکھائی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتولین کی دیت ادا کی اور کتے کے پانی

پینے کا برتن تک واپس فرما دیا اور اللہ کے حضور حضرت خالد کے اس فعل کی براٗت بھی پیش فرمائی۔ اس کے باوجود ان کو قیادت سے معزول نہیں فرمایا۔ یہ نظیر حضرت صدیقؓ کے سامنے موجود تھی۔ چنانچہ آپ نے بھی حضرت خالدؓ کو ان کی اس فروگذاشت پر ملامت تو کی مگر عہدے سے معزول نہیں کیا۔

ان دونوں انسانوں (حضرت فاروقؓ و صدیقؓ) کی متوازی عظمت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ان دلائل سے ہوتا ہے جو وہ دوران اختلاف پیش کیا کرتے۔ کسی ایک کے دلائل کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کسی پہلو سے کمزور یا بودے ہیں۔ بلکہ دونوں کے دلائل اپنی اپنی جگہ ٹھوس اور مضبوط ہوتے۔ اگرچہ ایک کے دلائل میں اقتداء واتباع کا جوہر نمایاں ہوتا اور دوسرے کے دلائل میں اجتہاد اور تخلیق کی نمود ہوتی۔

غنائم وانفال کے اموال بیت المال میں آئے اور انہیں مستحق مردوں اور عورتوں کے درمیان تقسیم کرنے کا مسئلہ پیش آیا تو حضرت فاروقؓ کی یہ رائے ہوئی کہ حصے کارگذاریوں اور خدمات کے مطابق تقسیم کئے جائیں۔ دلیل یہ تھی کہ جن لوگوں نے آنحضرتؐ کے خلاف جنگ کی ہے ان کو وہ مرتبہ نہیں دیا جاسکتا جو آپ کی معیت میں لڑنے والوں کو دیا جاسکتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کی رائے یہ تھی کہ ہر ایک کے مالی حصے برابر ہونے چاہئیں دلیل یہ تھی کہ اعمال کا اجر و ثواب خدا کے ذمہ ہے۔ دنیا کی زندگی میں مساوات

عدم مساوات سے بہتر ہے۔

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ملکی سیاست کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کھینچے ہوئے خطوط ہی پر چلایا۔ البتہ ہر اہم معاملہ میں اصحاب رائے سے مشورہ ضرور کرتے رہے اپنی رائے صرف وہیں استعمال فرمائی جہاں ذمہ داری خود آپ سے متعلق رہی اور دوسروں سے اس کا کوئی تعلق نہ رہا۔ اس کی مثال خلیفہ ثانی کا انتخاب ہے۔ مشاورت اور غور و خوض کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ خلافت حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب کے حوالہ کر دی جائے۔

اختصار کے ساتھ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی سیاست ملکی کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے ایک مقتدر، فعال اور مقتدی انسان کا پارٹ ادا کیا اور ان لوگوں کے مشوروں کو بھی نظر انداز نہ فرمایا جو ابتداد و اجتہاد کو ترجیح دیتے تھے۔ آپ نے راستہ اتباع و اقتداد کا اختیار فرمایا مگر کمزوری یا بے اعتمادی کے ساتھ نہیں اور نہ دوسروں پر بھروسہ کر کے۔ بلکہ اپنے کس بل پر۔ آپ نے اقتداد کی تو یہ ثابت کر دیا کہ آپ کے اندر دشوار، کٹھن اور بھاری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت ان لوگوں سے زیادہ ہے جن کا مزاج اجتہاد و تصرف سے زیادہ قریب تھا۔

مہم اسامہ رضی اللہ عنہ، مہم فتنہ ارتداد اور مہم ایران و روم کو سر کرنے کا سہرا جہاں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سر بلا شرکت غیر بندھتا ہے وہیں آپ کا ایک اور کارنامہ بھی ہے جس کو اگر یہاں قلم انداز کر دیا جائے تو آپ کے بلند مقام و مرتبہ کے ساتھ ناانصافی

ہوگی۔ اس کارنامے کا اگرچہ ان مہمات سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے لیکن دولت اسلامیہ کے حق میں یہ ان مہمات سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اس سے ہماری مراد اُمت کا وہ دستور ہے جس کے بغیر اُمت کا تخیل ہی بے معنی ہو کر رہ جاتا یعنے

جمع قرآن۔

جمع قرآن میں آپ نے وہی واضح راستہ اختیار فرمایا جس سے سرمو انحراف آپ کے مزاج کے خلاف تھا۔ اس سے مراد سنت، اتباع و اقتدا اور مشاورت ہے۔

جنگہائے ارتداد میں حفاظ قرآن کی ایک معتدبہ تعداد شہید ہو چکی تھی۔ اور ایران و روم کی لڑائیوں سے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ باقی ماندہ حفاظ بھی کہیں ان کی نذر نہ ہو جائیں اور اس طرح قرآن ضائع ہو جائے۔ حضرت عمرؓ نے یہ خطرہ بروقت بھانپ لیا اور خلیفہ کو جمع قرآن کا مشورہ دیا۔ خلیفہ نے ابتداءً تردد ظاہر کرتے ہوئے فرمایا: "میں وہ کام کیسے کروں جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا؟" لیکن مزید سوچ بچار کے بعد آپ کا دل حضرت عمرؓ کے مشورہ پر مطمئن ہو گیا۔ چنانچہ آپ یکسو کر جمع قرآن کے کام میں لگ گئے۔ اور مشہور روایات کے مطابق دوران خلافت ہی میں قرآن کریم ٹھیک اس صورت میں جمع کر دیا گیا جس صورت میں ہم آج اس کو پڑھتے ہیں۔

دولت اسلامیہ کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ایسی امانت تھی جس سے

بھاری امانت کا بوجھ انسانی کندھوں نے آج تک نہیں اٹھایا۔ اس یادگارِ زمانہ اور لافانی عہد کے مطالعہ و تحقیق کے بعد اس کے متعلق ہر بات تو کہی جا سکتی ہے مگر ایک بات کوئی بھی صاحبِ عقل انسان بقائمی ہوش و حواس نہیں کہہ سکتا۔ وہ یہ کہ کوئی دوسرا انسان اس بارِ امانت کو حضرت صدیقؓ سے بہتر طریق پر نباہ سکتا یا اس کو اپنے پاس سے منتقل کرتے وقت آپ سے زیادہ دور اندیشی کا ثبوت دے سکتا تھا۔

آپ نے یہ امانت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے لی اور اس کو حضرت عمرؓ جیسے اہل تر انسان کے سپرد کر دیا۔

حضرت صدیق رضؓ اور جدید حکومت

ہم گزشتہ فصل میں یہ بتا چکے ہیں کہ حضرت صدیق رضؓ کے عہد حکومت میں دولتِ اسلامیہ کو ایسے نظم و نسق کی ضرورت نہیں پیش آئی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ سیاسی نظم و نسق سے مختلف ہو۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت تک مفتوحہ علاقوں کے معاملات و حالات اس قابل نہ ہو سکے تھے کہ پوری ملت اسلامیہ کے لئے ایک مشترک نظم و نسق تجویز کر دیا جائے۔

یہ معلوم ہے کہ حضرت صدیق رضؓ پہلے خلیفہ تھے جنہوں نے عہد نبوت کے بعد اسلامی حکومت کی ذمہ داری سنبھالی۔ اس لئے یہ سوال یہاں قدرتی طور پر سامنے آتا ہے کہ حضرت صدیق نے وہ کون سا طرزِ حکومت اختیار فرمایا جو ان کی حکومت اور ان کے بعد میں آنے والی حکومت کا خصوصی امتیاز تھا۔ اور یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ اس حکومت اور موجودہ دور کی ان حکومتوں میں کون سی چیز مشترک ہے، جو جدید دستوری اصولوں پر چل رہی ہیں۔ حضرت صدیق رضؓ کی حکومت یا ان کے عہد

میں قائم شدہ اسلامی حکومت کو کس قسم کی حکومت کا نام دیا جا سکتا ہے اور موجودہ دور کے دستوری ڈھانچوں میں سے کس ڈھانچہ سے اس کا دستوری ڈھانچہ قریبی مشابہت رکھتا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جمہوری نظام حکومت، صدیقی نظام حکومت سے قریبی مشابہت رکھتا ہے لیکن ایک ہی دور کی مختلف قوموں میں اس نظام کی مختلف اشکال، مختلف دستوری قواعد و اصول اور مختلف تاریخی مقدمات پائے جاتے ہیں یہ ساری اشکال و قواعد نہ تو ایسے ہیں کہ اسلامی طرز حکومت کی اشکال و قواعد سے حرف بحرف ملتے ہوں اور نہ ایسے ہیں کہ یکسر مختلف ہوں۔

یہ تحقیق شدہ امر ہے کہ اس وقت کی اسلامی حکومت صد فی صد ان معنی میں جمہوری حکومت نہیں تھی جو معنی ہم آج اس لفظ سے لیتے ہیں لیکن یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ قرآن کریم نے جس ڈھانچہ پر اسلامی حکومت کو استوار کیا وہ ان حکومتوں کے نظاموں اور اصولوں سے دور کا تعلق بھی نہ رکھتا تھا۔ جن کو معیوب نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

اسلامی حکومت نے اگرچہ اپنا نظام موجودہ دور کے معروف جمہوری نظام کے طرز پر نہیں اٹھایا۔ مگر شخصی نظام حکومت (AUTOCRATIC FORM of GOVT.) کلیسائی نظام حکومت (THEOCRACY.) طبقاتی نظام حکومت (OLIGARCHY.) انارکزم اور ان تمام نظامہائے حکومت کو باطل قرار دیا جو انسان کو شخصی آزادی

سے محروم کرتے ہیں اور فطری راہ سے ہٹ کر چلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ شخصی حکومت (AUTOCRACY) جس میں ایک فرد واحد سیاہ و سفید کا مالک بن بیٹھتا ہے اسلام میں ممنوع ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ آپ معاملات میں لوگوں سے مشورہ لیں۔ وامرہم شوریٰ بینہم۔ ان کے معاملات باہمی مشورہ سے انجام پائیں۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم جن پر وحی الٰہی براہ راست نازل ہوتی تھی، خود سیاسی امور میں اپنے پیروکاروں سے مشورہ اور رائے لینے سے مستثنیٰ نہیں قرار دیئے گئے تو آپ کے علاوہ جو دوسرے ذمہ داران حکومت ہوں گے اُن کو مشاورت کا پابند بنانا اور استبداد بالرائے اختیار نہ ہونے دینا تو بدرجہ اولیٰ ضروری ہے۔

کلیسائی نظام حکومت (THEOCRACY) اس طرز حکومت کا نام ہے جس میں حکمران کو مقدس اور خدائی اوصاف کا حامل گردانا جاتا ہے اور یہ بھی اسلام میں ناجائز ہے۔ قرآن کریم مسلمانوں کو تعلیم دیتا ہے کہ رسول اللہ انہیں جیسے ایک انسان ہیں، کہانت ناجائز ہے۔ اور انسان اور اس کے رب کے درمیان کوئی تیسرا واسطہ نہیں۔

۲ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گورنروں اور امراء جیش کو حکم فرمایا کرتے تھے کہ وہ معاہدات اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام پر نہ کریں۔ آپؐ نے اپنے ایک گورنر سے فرمایا۔ ان کو اللہ اور اُس کے نبیؐ کا ذمہ نہ دو بلکہ اپنا اور ساتھیوں کا ذمہ

دو۔ کیوں کہ اگر تم اپنا اور اپنے ساتھیوں کا دیا ہوا ذمہ توڑو گے تو اتنا بُرا نہ ہوگا جتنا
بُرا یہ ہوگا کہ تم اللہ اور رسولؐ کا ذمہ دیدو اور پھر توڑ دو۔

حضرت صدیقؓ کو خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا گیا تو آپ نے فرمایا۔ میں صرف خلیفہ
رسولؐ ہوں اور لوگوں سے فرمایا کہ اگر میرے اندر کوئی کمزوری یا نقص نظر آئے تو
اس طرف توجہ دلانا اور مجھے راہ راست پر رکھنے کی کوشش کرنا۔

طبقاتی یا اعیانی حکومت میں انسانوں کی مٹھی بھر جماعت کے ہاتھوں میں
ملک کی پوری باگ ڈور ہوتی ہے۔ یہ نظام حکومت بھی اسلام میں جائز نہیں اسلام
بیعت کے معاملہ میں خواص و عام کی تمیز نہیں کرتا اور نہ نسلی سیادت کا قائل ہے
جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ

"سنو اور اطاعت کرو، اگرچہ تم پر کالا کلوٹا حبشی ہی امیر کیوں نہ بنا دیا
جائے۔"

انارکی خواہ وہ چند سرغنہ قسم کے افراد کی ہو یا خواہشات کے نتیجہ میں معرض
وجود میں آئی ہو، خواہ ملک کے عوام کی بے راہ روی اور ہوا پرستی کا مظہر ہو، اسلام
کی نظر میں اسی طرح ناجائز ہے جس طرح مذکورہ بالا دوسرے نظام ہائے حکومت
ناجائز ہیں۔ اس کی نگاہ میں محکومین کی خواہشات و مرضیات اصول حق و عدل
اور دستور و نظام شریعت سے بالاتر نہیں۔

قرآن کا ارشاد ہے:۔

"ان کے درمیان اللہ کی اتاری ہوئی (ہدایت) کے مطابق فیصلہ کرو۔
تمہارے پاس جو حق ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو
تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے ایک قانون اور منہاج زندگی تجویز
کیا ہے۔"

اگر ان معیوب اصول و مبادی سے نظام حکومت پاک ہو تو وہ حکومت صالح سمجھی جائے گی۔ خواہ اس کو آپ جس عنوان سے چاہیں معنون کریں اور جس نام سے چاہیں یاد کریں۔ حکومت کی جتنی اقسام پائی جاتی ہیں ارسطو کی تعبیر کے مطابق ان کو دو جامع اقسام میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ صالح حکومت محکوموں کی مصلحت کے لئے۔

۲۔ فاسد حکومت حاکموں کی مصلحت کے لئے۔

نظام حکومت کے جملہ اقسام کسی نہ کسی نوعیت سے مذکورہ بالا دونوں جامع اقسام کے دائرہ میں آجاتے ہیں۔

حضرت صدیقؓ کی حکومت موجودہ دور کی اصطلاح کے مطابق جمہوری حکومت تو نہ تھی مگر آج کی جمہوریت کے سامنے حکومت کی جو غرض و غایت ہے، وہ کسی طرح بھی اس غرض و غایت سے اعلیٰ و اشرف نہ تھی جو اسلامی حکومت میں مطلوب و مقصود تھی۔ اور نہ آج کا جمہوری نظام کچھ ایسے اصول و مبادی کا ابطال کرتا ہے جن کو اسلامی نظام نے باطل نہ قرار دیا ہو۔ اس حقیقت پر قرآن کریم احادیث

شریف اور مسلمانوں کا اجماع و اتفاق شاہد ہے۔

اب حکومت پر اس حیثیت سے بھی غور کر لیجئے کہ اس کا تعلق خلیفہ کی ذات اور اس کی عادات و اطوار سے کس نوعیت کا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی عادات و اطوار جو ہمیں معلوم ہیں ان میں اس تعلق کی روشن شہادت موجود ہے۔ عفت مآبی، صداقت نرمی و بردباری، حزم و تدبر اور اس قسم کے دوسرے اوصاف خلیفہ اوّل کے ہر عمل میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

منصبِ خلافت پر متمکن ہونے کے بعد کا واقع ہے کہ آپ اپنے ہاتھ میں فروختنی چادریں لئے بازار تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں حضرت عمرؓ سے ملاقات ہوئی۔

حضرت عمرؓ نے پوچھا "کہاں کا ارادہ ہے؟"

آپ نے فرمایا "بازار جا رہا ہوں"

حضرت عمرؓ نے فرمایا "مسلمانوں کی ذمہ داری آپ کے کندھوں پر ہے ایسی صورت میں یہ کاروبار کیسے کر سکتے ہیں؟"

آپ نے فرمایا "بال بچوں کو کہاں سے کھلاؤں گا؟"

حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ میں اور آپ دونوں بیعت المال کے انچارج حضرت ابوعبیدہؓ کے پاس چلتے ہیں تا کہ وہ آپ کا اور آپ کے اہل و عیال کا وظیفہ مقرر فرما دیں۔ چنانچہ چھ ہزار درہم سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔

آپ مدینہ کے ایک قریبی گاؤں سنح میں سکونت پذیر تھے اور وہاں سے وزانہ اکر عزیزوں اور بے بس لوگوں کی بکریاں دودھ جایا کرتے۔ بیعت خلافت ہو جانے کے بعد ایک نوجوان عورت کو کہتے سنا کہ آج ہمارے گھر کی بکریوں کو دوہنے والا کوئی نہ رہا۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ سن کر فرمایا۔ میری جان کی قسم! میں اب بھی تمہارے جانور دوہتا رہوں گا۔ چنانچہ آپ خلافت کے زمانہ میں بھی اُس کے جانور دوہتے رہے۔ بلکہ بعض اوقات اُس سے یہ بھی کہا کہ بیٹی! اگر تم کہو تو تمہارے جانوروں کو گھما پھرا لاؤں؟ اگر اُس نے اثبات میں جواب دیا تو آپ نے اُس کی خواہش پوری کر دی۔

جب حکومت کی گوناگوں ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا تو آپ مدینہ منتقل ہو گئے اور یہاں برابر اس امر کی کوشش فرماتے رہے کہ جہاں تک ہو سکے نان و نفقہ تجارت کے ذریعہ خود حاصل کریں۔

(جب وفات کا وقت آیا تو آپ نے حکم فرمایا کہ آپ نے بیت المال سے جو کچھ اب تک لیا ہے اُس کا حساب کر لیا جائے۔ اور کل رقم آپ کی ذاتی ملکیت سے واپس کر دی جائے۔ آپ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا "جب میں وفات پا جاؤں تو مسلمانوں کے برتن، ان کا غلام، اُن کی اونٹنی، اُن کی چکیاں اور اُن کی دو چادریں جو میں اوڑھنے اور بچھانے کے لئے استعمال کرتا تھا، واپس کر دی جائیں۔)

روایات میں آپ کی عفت اور زہد کے متعلق آتا ہے کہ آپ کی زوجہ محترمہ کو حلوہ کھانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ انہوں نے چند دن روزینہ سے کچھ رقم پس انداز کر کے حلوہ خریدا۔ جب آپ کو اس بات کا علم ہوا تو آپ نے بیت المال میں کچھ درہم واپس فرمائے اور اس حساب سے یومیہ خرچ میں کمی کر دی۔ آنحضرتؐ کا یہ مخلص دوست اپنے لئے کوئی ایسی چیز جائز نہیں سمجھتا تھا جس کو خود آنحضرتؐ نے اپنے لئے پسند نہ فرمایا ہو، حالانکہ اپنے خاص مال سے ایسا کر لینے میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔

آپ میں حلم و بردباری تو تھی ہی، حزم و تدبر سے بھی آپ کبھی غافل نہ رہے چنانچہ آپ گورنروں کی کارروائیوں پر نگاہ رکھتے اور رعایا کے حالات سے بھی باخبر رہتے۔ اگر کہیں ظلم و بے انصافی نظر آتی تو اپنے معروف مزاج کے مطابق مظلوم کی داد رسی فرماتے اور بڑا آپ کی نگاہ میں اس وقت تک چھوٹا رہتا جب تک اس سے حق وصول نہ کر لیا جاتے۔

کونسا قائد

آپ ایک قائد کو وصیت فرماتے ہیں:-

"تم اپنے اہل لشکر کی طرف سے غافل نہ رہنا کہ ان میں فساد رونما ہو جائے، ان کا اس حد تک تجسس نہ کرنا کہ وہ ذلت و رسوائی محسوس کرنے لگیں۔ لوگوں کی پردہ دری نہ کرنا بلکہ ان کے ظاہری حالات پر اکتفا کرنا۔"

آگے فرماتے ہیں:۔

"ان کا ظاہر قبول کر لو اور ان کے باطن کو خود اُن پر چھوڑ دو۔"

پھر حکم فرماتے ہیں کہ:۔

"ان سب باتوں کے باوجود لوگوں کے معاملات سے پوری آگاہی رکھنا اور جہاں کہیں فساد نظر آئے اس کی اصلاح کر دینا۔"

(آپ کی دانشوری کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے قدیم وجدید قضاء کے ایک ایسے دائمی اصول کو زندگی بخشی جو قضاء کی روح کی حیثیت رکھتا ہے مسلمان قضاۃ نے بھی اس اصول کو اپنایا اور عصر جدید کی حکومتیں بھی اپنے فیصلوں میں اس کا التزام ضروری خیال کرتی ہیں۔ اس اصول سے ہماری مراد یہ ہے کہ قاضی جرم سے آگاہ ہونے کے باوجود بھی قانونی ثبوت پہنچے بغیر تعزیر نافذ نہیں کر سکتا۔ حضرت صدیقؓ نے اس اصول کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا۔ اگر میں کسی آدمی کو خدا کی کوئی حد توڑتے دیکھوں تو اس کو اس وقت تک سزا نہیں دے سکتا جب تک میرے ساتھ کوئی اور گواہ موجود نہ ہو۔)

آپ کی جو وصیت بھی تاریخ میں محفوظ ہے اس میں آپ کی یہ دونوں خصوصیات یعنی دانشوری اور صداقت نمایاں نظر آتی ہیں۔ آپ نے گورنروں کو جہاں یہ نصیحت فرمائی کہ وہ لوگوں کی پردہ دری نہ کیا کریں، وہاں یہ نصیحت بھی فرماتے رہے کہ وعدہ وعید کی بھی خلاف ورزی نہ کریں۔

اس کا خلاصہ آپ کی اس نصیحت میں موجود ہے جو آپ نے عکرمہؓ کو فرمائی:

"جب تم یہ کہو کہ میں یہ کروں گا تو اس کو کر گذرو۔ سزا یا درگذر کے معاملہ میں کبھی مہمل بات نہ کہو۔ جب تم کسی کو امن دو تو اس سے کوئی امید نہ وابستہ رکھو۔ جب تمہیں ڈرایا یا دھمکایا جائے تو اس کی پروا نہ کرو۔ بلکہ صرف اور صرف یہ دیکھو کہ تم کیا کہہ رہے ہو اور کیوں کہہ رہے ہو کسی معصیت کی سزا میں حد سے تجاوز نہ کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے، تو گنہگار ہو گے۔ اور اگر سزا دینا ترک کرو گے تو جھوٹ کے مرتکب ہو گے۔"

آپ کا پورا دور حکمرانی حلم و بردباری، صداقت شعاری، حزم و تدبر، دانشوری اور دوربینی کی اسی سنت پر چلتا رہا۔ اس پورے دور میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جس سے آپ پر کوئی حرف آتا ہو۔ سوائے ایک واقعہ کے اور وہ یہ کہ آپ نے فجاءہ کو نذر آتش کر دینے کا حکم دے دیا تھا۔ اس خائن اور سفاک ڈاکو کی سزا کے معاملہ میں آپ کو اپنے غصے سے پوری کشمکش کرنی پڑی اور غلبہ آخر اس غصہ ہی کے ہاتھ رہا۔

یہ فجاءہ ——— ایاس بن عبد یالیل ——— حضرت صدیقؓ کے پاس آیا اور آپ سے مرتدین کے مقابلہ کے لیے اسلحہ طلب کیا۔ اسلحہ مل جانے پر ڈاکہ زنی، غارت گری اور خونریزی شروع کر دی۔ بلا تمیز مسلم و مرتد لوٹ مار کا پیشہ اختیار کر لیا اور شرانگیزی و بغاوت حد سے گذر گئی۔ آخر کار گرفتار ہوا اور خلیفہ کے

"اگر اسے پسند کیا جاتا تو بہ اِلی بیٹھنے میں توہیبت لی ہے

سامنے لایا گیا۔ آپ نے ضروری خیال کیا کہ اس قاتل اعظم کو جرم قتل سے بھی بڑی سزا
دی جائے۔ یہ مجرم ہر وہ حرکت کر گذرا تھا جو غیظ و غضب کا باعث بن سکتی ہے
اس نے حلم و بردباری کی تمام راہیں اپنے اوپر خود مسدود کر دی تھیں۔ اس نے جھوٹ
کا ارتکاب کیا تھا اور آپ جھوٹ سے طبعی بغض و نفرت رکھتے تھے۔ اس نے مکر
و فریب کا ارتکاب کیا تھا اور آپ دل سے اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ کوئی
شخص اس قسم کی عیّارانہ چالوں کے ذریعہ آپ کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جائے
اس نے مسلمانوں کا قتل و خون کیا تھا اور یہ آپ کی غیرت و حمیّت کا کڑا امتحان تھا
غرض اس کا جرم اتنا عظیم تھا کہ معافی یا نرمی کا سوال خارج از بحث ہو چکا تھا۔
چنانچہ آپ نے حکم دیا کہ اس کو بقیع کے مقام پر بھڑکتے ہوئے الاؤ میں جھونک دیا
جائے۔

یہ ایک فروگذاشت تھی جو آپ سے سرزد ہو گئی۔

اگرچہ یہ ایسی فروگذاشت ہے جس کی وجہ جواز خود اس کے اندر موجود ہے۔ مگر
حضرت ابوبکرؓ نے خود اس کو اپنی فروگذاشت ہی پر محمول کیا اور غصّہ دور ہو جانے کے
بعد اس پر ندامت کرتے رہے۔ آپ کے ذہن میں جب اس واقعہ کی یاد آجاتی، تو
افسوس فرماتے۔ ایک مرتبہ فرمایا: "کاش! میں نے فجاءہ سلمی کو جلانے کی بجائے قتل
کر دیا ہوتا یا زندہ چھوڑ دیتا"۔

اس واقعہ کے متعلق متاخرین و متقدمین کی رائے خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو،

اس سے ہمیں کچھ زیادہ بحث نہیں۔ بحث صرف اس امر سے ہے کہ اس کی ذمہ داری اسلام پر نہیں ڈالی جاسکتی اور نہ صرف اس ایک واقعہ کو لے کر حضرت ابوبکرؓ کی پوری زندگی کو موردالزام ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ اس قسم کے جزوی واقعات کی نظیریں ہمیں ہر زمانہ میں ملتی ہیں مگر اس طرح کے کسی واقعہ کو لے کر نہ تو کسی دین کو مطعون کیا جاتا ہے اور نہ کسی حکومت کو بُرا کہا جاتا ہے۔

بلینا کا مشہور واقعہ ابھی نصف صدی سے بھی کم عرصہ کی بات ہے جس میں ایک انگریز انسپکٹر اور لارڈ کرومر کے حکم سے ڈاکوؤں کی ایک پوری جماعت نذر آتش کردی گئی۔ حالانکہ لارڈ کرومر کا شمار اعلیٰ درجہ کے مسیحیوں میں ہوتا ہے۔ اس واقعہ کی آڑ لے کر نہ تو کوئی دین مسیحی میں میں میخ نکالتا ہے اور نہ ہی انگریزی قانون کے بودے پن پر انگشت نمائی کرتا ہے۔ بلکہ اس کو اسی حد کے اندر رکھا جاتا ہے جس حد کے اندر رکھے جانے کا وہ مستحق ہے اور اس حد سے آگے بڑھنے کو زیادتی تصور کیا جاتا ہے۔

اسلام پر ذمہ داری اسی وقت ڈالی جاسکتی ہے جب کہ اس کے قواعد و اصول میں اس قسم کی کوئی گنجائش موجود ہو۔ اسی طرح ابوبکرؓ کو بھی موردالزام اس صورت میں گردانا جاسکتا ہے جب ان کی حکومت کا یہ عام قاعدہ بن چکا ہو۔ رہا یہ شاذ واقعہ تو اس کو عارضی غلطی پر محمول کیا جائے گا جس کی وجہ جواز خود جرم کے گھناؤنے پن اور سزا دینے والے کی ندامت میں موجود ہے۔ اگر کوئی

شخص تنقید میں غلو سے کام لیتے ہوئے اور اس ایک واقعہ کو سامنے رکھ کر ایک دور کو دوسرے دور سے اور ایک حاکم کو دوسرے حاکم سے بہتر ثابت کرنا شروع کر دے تو اس کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کی نیت صاف نہیں اور وہ عصر جدید سے بھی واقفیت نہیں رکھتا۔

خلاصہ بحث یہ کہ اس واقعہ کو حضرت ابوبکرؓ کی حکومت کا جزء قرار دیا جائے یا اس کو حذف کر دیا جائے۔ دونوں صورتوں میں سے ہر صورت میں یہ حکومت اپنی دو جامع خوبیوں کی وجہ سے موجودہ دور کی ترقی یافتہ حکومتوں کے لیے اسوہ و نمونہ ہے۔

پہلی خوبی تو یہ کہ اس حکومت نے ان تمام غلط اصولوں کو مٹا دیا جن کی وجہ سے کسی حکومت کو کسی عنوان سے غلط حکومت کہا جاتا ہے۔

دوسری خوبی یہ کہ اس نے اپنی غرض و غایت کو اتنا بلند کر دیا جس سے اوپر کسی انسانی حکومت کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور وہ غرض و غایت فرد کی آزادی اور محکوموں کے مفاد و مصلحت سے تعبیر ہے۔

صدیقِؓ نبیؐ اور صحابہؓ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ "آپؐ کی نظر میں کون شخص سب سے زیادہ محبوب ہے؟"

آپؐ نے فرمایا۔ "عائشہؓ!"

لوگوں نے عرض کیا۔ "ہماری مراد مردوں سے ہے!"

آپؐ نے فرمایا۔ "اس کا باپ۔"

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ "جن لوگوں نے بھی ہم پر کوئی احسان کیا ہم نے اس کا بدلہ دے دیا۔ سوائے ابوبکرؓ کے اس کا ہم پر اتنا بڑا احسان ہے کہ اس کا بدلہ خدا خود ہی قیامت کے دن دے گا۔"

مذکورہ بالا ارشادِ نبویؐ کی تفسیر آنحضرتؐ کے ایک دوسرے قول سے ہوتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ "کسی کا مجھ پر ابوبکرؓ سے بڑھ کر احسان نہیں۔ انہوں نے اپنی جان و مال سے میری دلدہی کی اور اپنی لڑکی میرے نکاح میں دی۔"

(حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ "حضرت ابو بکرؓ ہم سب میں بزرگ تھے۔ ہم سب سے بہتر تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں ہم سب سے زیادہ عزیز تھے۔")

یہ ایسی حقیقت ہے کہ اگر لسان قال کی تائید اس کو حاصل نہ ہوتی تو لسان حال سے ہی اس کی تائید ہو جاتی۔ حضرت ابو بکرؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب رہنے کا جس قدر اتفاق ہوا تھا، وہ جس قدر آنحضرتؐ کے ظاہر و باطن سے واقف تھے اور ان پر آنحضرتؐ کو جس قدر اعتماد تھا وہ کسی اور کو حاصل نہ تھا۔ رسول اللہؐ راتوں کو دیر دیر تک ان کے یہاں مسلمانوں کے معاملات اور مسائل پر گفتگو فرماتے رہتے۔ اور بسا اوقات ان کے مشوروں کو بڑی وقعت دیتے اگر کوئی شخص اس بات کا مستحق ہو سکتا تھا کہ آنحضرتؐ کی نظر میں عزیز تر ہو تو اُس کا سب سے زیادہ استحقاق حضرت ابو بکرؓ کو ہی پہنچتا تھا۔

محبت، اعتماد اور قدردانی اعاظم رجال کے نفوس کے اجزاد لاینفک ہیں جو ان سے کبھی جدا نہیں ہوتے۔ ان کی نظروں میں جو شخص زیادہ محبوب و عزیز ہو گا وہ اعتماد و قدردانی کا بھی مستحق ہو گا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابو بکرؓ سے جو محبت تھی وہ صرف اس وجہ سے نہ تھی کہ حضرت ابو بکرؓ بھی آپؐ سے محبت کرتے اور آپ پر سب کچھ نچھاور کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ بلکہ یہ محبت اس وجہ سے بھی تھی کہ حضرت

ابو بکرؓ اپنی ذاتی خصوصیات، اپنے اعلیٰ اوصاف، اپنے بے لوث کردار اور با کمال صلاحیتوں کی وجہ سے آنحضرتؐ کی نظر میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔

آپؐ نے اپنی جگہ جس وقت حضرت ابو بکرؓ کو امامت کے لئے آگے بڑھایا تو اس کا محرک محض ذاتی محبت واخلاص نہ تھا۔ بلکہ اس کا اصل محرک یہ تھا کہ آپؐ کو ان پر کلی اعتماد تھا۔ ان کی دور اندیشی و دوربینی پر آپؐ کو پورا یقین تھا۔ اس دعوت کا مفاد پیش نظر تھا جس کے لئے حضرت ابو بکرؓ اب تک سینہ سپر رہے تھے اور ان مسلمان کی سلامتی و استحکام مقصود تھا جو اس دعوت پر ایمان رکھتے تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسا نبی اپنے دین کا مستقبل محض دوستی پر قربان کر دے ایسا ناممکن تھا۔ بلکہ اس سے یہی توقع ہو سکتی تھی کہ آپؐ اس دین کا مستقبل ان ہاتھوں میں دیں گے جو اس امانت کو اٹھانے کی اہلیت رکھتے ہوں گے اور ان کو اس کی حفاظت پر پوری قدرت حاصل ہوگی۔

حضرت ابو بکرؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت تھی اُس کا سرچشمہ جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں، ایمان و گرویدگی اور اخلاص تھا۔ اور انسان جب اس کوچہ میں قدم رکھتا ہے تو پھر اس کو اپنی جان و مال اور اہل و عیال کی خبر نہیں رہتی۔ وہ اپنے ماضی اور حاضر و موجود سب سے بیزار ہو کر سب پر غالب آ جانا چاہتا ہے۔ وہ حاضر و موجود کو بدل دینے کے معاملہ میں پُر اُمید ہوتا ہے۔ مستقبل کے بارے میں پُر امید ہوتا ہے بلکہ وہ سراپا امید ہوتا ہے۔

جس گھڑی ان دونوں ہستیوں کے مابین محبت وصداقت کے عہد وپیمان
ہوئے اسی گھڑی صادق اور امین دوست بغیر کسی مطالبہ کے اس بات پر رضا
مند ہو گیا کہ اپنی عزیز سے عزیز تر چیز اس دوستی وصداقت کی راہ میں قربان کر
دے۔ اُس نے اس راہ میں اپنا مال لٹایا، وطن کو خیر باد کہا، بیوی بچوں سے جدا
ہوا، اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر مدینہ ہجرت کی اور خطرات کے نرغے میں ہونے
کے باوجود اگر کسی چیز کا غم رہا تو صرف اپنے اس ساتھی کا جس پر وہ اپنا سب
کچھ قربان کر دینے کو تیار تھا۔ کبھی اس کے آگے ہو لیتا اور کبھی اُس کے پیچھے آجاتا
تا کہ دوست پر کوئی آنچ نہ آسکے۔ پھر تادم واپسیں اپنے اس عہد پر قائم رہا اور
اس حالت میں کہ اس راہ میں ضائع ہو جانے والی کسی چیز پر نہ کبھی کف افسوس
ملا اور نہ نادم ہوا۔

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ حضرت ابو بکرؓ جس طرح رسول اللہ کی زندگی
میں اپنے عہد وپیمان پر قائم رہے اُسی طرح آپ کی وفات کے بعد بھی آپ میں
سرمو فرق نہیں آیا۔ جو لوگ عقل وفہم رکھتے ہیں اور انصاف پسند ہیں بلکہ وہ لوگ
جو سمجھ بوجھ تو رکھتے ہیں مگر انصاف پسندی سے عاری ہیں ان کے نزدیک بھی یہ
بات مسلم ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کا ہر قول وفعل آخر وقت تک اس عہد وپیمان
کا شاہد رہا۔

= کوئی صاحب عقل وخرد حضرت صدیقؓ کے عشق نبیؐ کو اس بنیاد پر مطعون نہیں

کر سکتا کہ انہوں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو میراث سے محروم کر دیا تھا۔ انہوں نے اگر حضرت فاطمہؓ کو میراث سے محروم کیا تھا تو حضرت عائشہؓ کو بھی تو وراثت میں کوئی حصہ نہیں دیا تھا) کیونکہ شریعت محمدیؐ میں انبیاء کی وراثت جائز نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی یہ نیت ہرگز نہ تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث آپؐ کے وارثین کو نہ دیں جب کہ خود ان کی عزیز ترین صاحبزادی بھی انہیں وارثین میں شامل تھی۔ بلکہ ان کی صرف اور صرف یہ خواہش تھی کہ دین کو بصورت تمام و کمال محفوظ رکھا جائے اور یہ حفاظت و صیانت مال و اولاد کی حفاظت و صیانت سے بہر حال بہتر ہے۔

(حاشیہ: نبی کو وراثت سے نہیں دیا تھا)

اسی طرح یہ کہنے کی گنجائش نہیں کہ حضرت صدیق نے حضرت علیؓ کو حقِ خلافت سے محروم کر دیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے بس میں نہ تھا کہ وہ حضرت علیؓ کو کسی ایسی چیز سے محروم کر دیں جس کی وصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دی ہو۔ پھر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ لوگوں نے آنحضرتؐ کے اس سلسلے کے فرمودات پر پردہ ڈال دیا ہوگا۔ کیونکہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کسی وقت بھی آنحضرتؐ کے سرِ مبارک سے جدا نہیں ہوئیں۔ خود حضرت علیؓ اگر قرآن اور حدیث سے دلیل پیش کرنا چاہتے تو ان کے زورِ استدلال کے آگے کون ٹھہر سکتا تھا؟ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو وہ قوت و اقتدار کہاں حاصل تھا جس کے بل بوتے پر وہ بغیر کسی دلیل و برہان کے خلافت اہل بیت یا انصار و مہاجرین

کے ہاتھوں سے زبردستی چھین لیتے؟ ان کا بغیر حیلہ سازی، بغیر مکروفریب اور بلا ایک قطرہ خون بہائے خلافت کے منصب پر پہنچ جانا خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ اسلامی حکومت کی سربراہی کے ہر شخص سے زیادہ مستحق اور سزاوار تھے۔ اور اس کو چلانے کی ہر شخص سے زیادہ صلاحیت رکھتے تھے۔ خلافت حاصل کرنے کے بعد دین کی جڑوں کو مضبوط کر دینا اور اسلامی حکومت کو نئی زندگی بخشنا یہ ساری باتیں اس امر کا مزید روشن ثبوت ہیں۔

آنحضرتؐ کے بعد ایسے واقعات پیش آئے جن کا پیش آنا ناگزیر تھا اور جن کا پیش آنا تعجب خیز بھی نہیں۔ کیونکہ نیا نیا معاملہ تھا اور اس سے نپٹنے کے لئے سابق نظیریں موجود نہیں تھیں۔ انہیں سلسلہ واقعات کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ چند ماہ تک بیعت سے گریز کرتے رہے۔ اگرچہ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ انہوں نے بیعت کے معاملہ میں چند دن یا چند گھنٹے سے زیادہ تاخیر نہیں کی۔ یہ مدت تھوڑی ہو یا زیادہ بہرحال یہ مسلم ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ دونوں بزرگوں نے کبھی ایسا رویہ اختیار نہیں کیا جس سے ان پر حرف آسکے۔ حضرت ابوبکرؓ ان کو مدینہ کی حراست و نگہبانی کے معاملات پر غور و خوض کرنے کے لئے برابر بلاتے رہے اور وہ پورے صدق و اخلاص کے ساتھ ہر مشورہ میں شریک ہوتے رہے۔ اگر یہ بات صحیح مان لی جائے کہ حضرت ابوبکرؓ نے کوئی ایسا حق چھپا رکھا تھا جس کو پردہ اخفا میں رکھنا ان

کو زیب نہیں دیتا تھا تو یہ ناممکن تھا کہ حضرت علیؓ ان کی بیعت کر لیتے اور ان کی خلافت پر رضامندی کا اظہار کر دیتے یا بعد کے خلفاء کے ساتھ تعاون کرتے ایسی صورت میں بعض ہوا پرست لوگوں کی یہ بات کیسے قابلِ اعتنا ہو سکتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے قرآن کی بعض آیات کو محو کر دیا جو مسند خلافت سے متعلق تھیں یا حدیث کے بعض ان حصوں کو ظاہر نہیں ہونے دیا جن میں اس مسئلہ کی صراحت موجود تھی۔

زیادہ سے زیادہ جو بات اس حدیث میں پیش آنے والے واقعات کے متعلق کہی جا سکتی ہے وہ محض اتنی ہے کہ ان میں تھوڑا سا ناخوش گوار پہلو تھا۔ جو دوسرے بہتر پہلوؤں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔/

حضرت صدیقؓ نے اپنے بعد حضرت عمرؓ کے حق میں خلافت کی وصیت فرمائی اس موقع پر یہ گنجائش نہیں کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے استخلاف کا موازنہ کیا جائے لیکن ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ حضرت صدیقؓ نے اس مسئلہ کو معمولی اہمیت نہ دی تھی بلکہ اس کو پورے غور و فکر کا مستحق سمجھا تھا اور ان کی یہ خواہش تھی کہ مسلمان جس کو پسند کریں اُس کو ہی ذمہ داری کے لئے خود منتخب کریں۔ چنانچہ منتخب اصحاب الرائے کو جمع کیا اور ان سے بہت سی باتیں کیں جن کا کچھ حصہ یہ ہے۔

(اللہ تعالٰے نے آج تم کو میری بیعت سے آزاد کر دیا ہے۔ تمہاری گردنوں

سے میرا قلادہ کھول دیا ہے اور دوبارہ تمہارا معاملہ تمہارے سپرد کر دیا ہے۔ تم جسے چاہو اپنا امیر منتخب کر لو۔ اگر تم میری زندگی ہی میں انتخاب امیر کا مرحلہ طے کر لو گے، تو میرے بعد اختلاف کی کم سے کم گنجائش باقی رہ جائے گی۔)

(حسن بصری کی روایت میں آتا ہے کہ اس وقت لوگوں کو کوئی بات نہ سوجھی اور انہوں نے حضرت صدیقؓ سے درخواست کی کہ آپ خود ہی کوئی فیصلہ کر دیجئے اے جانشین رسولؐ! آپ کا فیصلہ زیادہ صائب ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ان سے مہلت طلب کی تاکہ اچھی طرح یہ جائزہ لے لیں کہ اللہ کے دین اور بندوں کی بہتری اور فلاح کی صورت کیا ہو سکتی ہے۔

عبدالرحمٰنؓ بن عوف، عثمانؓ بن عفان، سعیدؓ بن زید اور اسید بن حضیر سے مشاورت کے بعد حضرت صدیقؓ اس فیصلے پر پہنچے کہ حضرت عمرؓ کو خلیفہ بنایا جائے۔

اس سلسلے میں حضرت علیؓ سے بھی مشورہ کیا۔ انہوں نے فرمایا: "آپ حضرت عمرؓ سے حسن ظن رکھتے ہیں اور ان کے متعلق آپ کی رائے اچھی ہے۔ وہ آپ کے ساتھ حکومت کے بہت سے فرائض بھی انجام دیتے رہے ہیں۔ اگر آپ ان کو اس منصب پر مامور کر دیں گے تو ہم ان کی رائے سے استفادہ کریں گے۔ آپ کا جو ارادہ ہے کر گذریئے ہم سے مشورہ کی حاجت نہیں۔ اگر وہ آپ کی رائے کے مطابق ثابت ہوئے تو یہ آپ کی خواہش کے عین مطابق ہوگا۔ اگر آپ کی رائے غلط ثابت ہوئی تو آپ نے بہرحال نیکی کے ارادہ سے ایسا کیا ہے۔"

حضرت ابوبکرؓ نے وصیت نامہ حضرت عثمانؓ بن عفان سے املا کرایا۔ انہوں نے لکھ کر اس پر مہر لگائی اور اس کو لے کر لوگوں کے مجمع میں گئے اور وہاں اعلان کیا کہ "اس وصیت نامہ میں جس شخص کا نام ہے کیا تم اس کے ہاتھ پر بیعت کے لئے تیار ہو؟"

کہا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اس وقت اپنے جھروکے سے یہ منظر خود ملاحظہ فرما رہے تھے۔ آپ نے وہیں سے فرمایا "لوگو! میں نے وصیت نامہ خود تیار کیا ہے۔ کیا تم اس پر رضامند ہو؟"

(لوگوں نے عرض کیا "ہم رضامند ہیں، اے جانشین رسولؐ!"

حضرت علیؓ نے کھڑے ہو کر فرمایا "اگر اس کے اندر حضرت عمرؓ کا نام ہے، جب تو ہم رضامند ہیں ورنہ نہیں"

پھر مسلمانوں کے اتفاق سے بیعت انجام پذیر ہوئی۔)

حضرت صدیقؓ اور اہل بیت کے درمیان جن مسائل میں اختلاف ہوا وہ یہ دو مسئلے ہیں۔ ایک میراث کا مسئلہ اور دوسرا خلافت کا مسئلہ۔

مسئلہ میراث میں حضرت صدیقؓ نے جو فیصلہ کیا اس کے علاوہ کوئی اور فیصلہ کرنا ان کے لئے ناممکن تھا۔ اس لئے کہ آنحضرتؐ کی صراحت موجود تھی کہ نبیؐ کی کوئی میراث نہیں ہوتی۔ اس حکم میں حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہؓ دونوں مساوی تھیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ آپ نے اپنی وفات کے وقت حضرت عائشہؓ

کو یہ وصیت فرمائی کہ آپ نے خود جو مال ان کو ہبہ فرمایا ہے، وہ اس سے مسلمانوں کے حق میں دستبردار ہو جائیں۔ حالانکہ ان کے لئے باپ کا مال اور میراث دونوں چیزیں جائز تھیں۔

مسئلہ خلافت میں اگر رواداری سے کام لیا جاتا تو اس کو قابل ستائش نہیں قرار دیا جاتا۔ اس لئے کہ یہ ذاتی مسئلہ نہ تھا بلکہ اس کا تعلق بندہ اور اس کے رب سے تھا اور اسلامی وحدت اور مسلمانوں کے اجتماعی مفاد سے تھا۔

ان دو مسئلوں کے علاوہ حضرت صدیقؓ نے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے ساتھ ہر طرح کی رواداری اور حسن سلوک اپنے لئے ضروری خیال کیا۔ اور اہل بیت کے دقار کی حفاظت میں ادنیٰ فروگذاشت بھی نہیں ہونے دی بلکہ ان کی خوشنودی اور اطمینان کے لئے جو کچھ بھی ممکن تھا سب کیا۔

حضرت ابوبکرؓ نے صحابہؓ کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہی سنت اختیار کی جو ان کی فطرت کا جزو لاینفک بن چکی تھی۔ یعنی نرمی، مروّت اور حیا کا زویہ آپ ان کے ساتھ حسن معاشرت سے پیش آتے اور ان کے لئے وہی چیزیں ضروری قرار دیں جو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں ضروری قرار دی تھیں ان لوگوں کو اپنے حقوق کے بارے میں آپ سے کبھی کوئی شکایت نہیں پیدا ہوئی سوائے ایک شکایت کے جو سارے صحابہؓ کو نہیں بلکہ اُن میں سے چند لوگوں کو تھی۔ وہ یہ کہ آپ نے مال کی تقسیم میں عورتوں اور غلاموں اور خود ان میں

کوئی امتیاز نہیں کیا۔ یہ آپ کی ایک رائے تھی جس کے دلائل پر ہم پہلے بحث کر چکے ہیں اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں کی خدمات و مراتب کا بدلہ دینا اللہ کا کام ہے۔ اس زندگی میں مساوات ہی زریں اصول ہے۔

ان سب لوگوں میں حضرت عمرؓ آپ سے سب سے زیادہ قریبی تعلق رکھنے والے اور آپ کے معتمد تھے۔ آپ ان کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ان کے قول و فعل میں جو ظاہری خشونت اور شدت پائی جاتی ہے اس کا محرک جذبۂ رحمت و شفقت ہے نہ کہ کچھ اور۔ جیسا کہ بعض صحابہؓ کا خیال تھا۔ آپ نے حضرت عمرؓ کے متعلق حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی رائے معلوم کی۔ انہوں نے جواب دیا "ان کے متعلق آپ جو رائے رکھتے ہیں، میری رائے اس سے بھی اونچی ہے مگر ان میں کچھ سختی پائی جاتی ہے۔"

آپ نے اپنے سابقہ تجربہ کی روشنی میں فرمایا "حضرت عمرؓ کا رویہ ویسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو۔ مگر ایسا اس وجہ سے ہے کہ وہ میرے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ میں نرم ہوں (مطلب یہ تھا کہ توازن برقرار رکھنے کے لئے)، اگر معاملات کی باگ ڈور ان کے سپرد کر دی جائے گی تو ان کے اندر سے وہ بہت سی چیزیں ختم ہو جائیں گی جو اس وقت موجود ہیں۔"

حضرت ابوبکرؓ نے اس بات کو ترجیح دی کہ آپ کے پاس مدینہ منورہ میں منتخب صحابہ ضرور موجود رہیں۔ چنانچہ آپ انہیں صوبوں یا ملک کے دوسرے

حصوں میں بھیجنے سے گریز فرماتے رہے کیونکہ یہ لوگ اس قابل تھے کہ ان سے مشورے لئے جائیں مشکل معاملات میں ان کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور حکام وولاۃ کی نگرانی کے کام میں ان کو اپنے ساتھ شریک رکھا جائے۔ اہل بدر کے متعلق آپ سے پوچھا گیا کہ آپ انہیں کیوں کبھی سرکاری کام پر مامور نہیں فرماتے؟ آپ نے فرمایا: میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ ان کو دنیا میں ملوث کروں۔ غالباً ملوث نہ کرنے سے آپ کی مراد یہ رہی ہوگی کہ آپ ان کو دنیا کی فتنہ سامانیوں، حکمرانی کے چسکے اور مال ومتاع کے فریب سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

ہم تحقیق کے ساتھ اس نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے کہ صاحبین میں سے کون اس سیاست کا موجد اوّل تھا جس پر دونوں حضرات کا اتفاق تھا اور جس سے دونوں حضرات نے اشد ضرورت کے بغیر کبھی انحراف نہیں فرمایا۔ اس سیاست سے ہماری مراد صحابہ کبار کو سرکاری مناصب پر کم سے کم مامور کرنے کی پالیسی ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ اس پالیسی میں انتہائی سخت تھے۔ اس سختی سے یہ خیال گذرتا ہے کہ شاید یہ پالیسی پہلے انہیں کے ذہن رسا نے سوچی ہوگی۔ حضرت ابوبکرؓ بعض اوقات اس پالیسی کے خلاف بھی عمل پیرا ہو جاتے اور حضرت عمرؓ آپ کو ایسا کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ معاذ بن جبل شام چلے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد اہل مدینہ نے بڑا خلا محسوس کیا۔ وہ ان کو فقہی قوانین اور دینی مسائل بتایا

کرتے تھے۔ میں نے ابوبکرؓ سے کہا کہ "لوگوں کو معاذ کی ضرورت ہے۔ اس لئے آپ ان کو روک لیں۔ انہوں نے میری بات نہیں مانی اور کہا کہ جو شخص جہاد کے ذریعہ شہادت چاہتا ہو، میں اس کو نہیں روک سکتا۔ میں نے کہا کہ انسان کو اپنے بستر پر بھی شہادت نصیب ہو سکتی ہے۔

مگر حضرت ابو بکرؓ بعض صحابہؓ کو باہر بھیجنے کے معاملہ میں اس قدر محتاط تھے گویا آپ کو ان کی کمزوریوں کا علم الیقین حاصل ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کو جو آخری وصیت آپ نے فرمائی اس میں اس بات کو نظر انداز نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا:-

("اصحاب رسولؐ میں سے ان چند لوگوں سے ضرور چوکنے رہنا، جن کے پیٹ پھولے ہوئے ہیں۔ جن کی آنکھوں میں حرص و آز پیدا ہو چکی اور جن میں سے ہر شخص کو اپنا مفاد عزیز ہے۔ ان کی ایک لغزش بڑی گمراہی کا سبب بن سکتی ہے۔ دیکھنا! ایسا ہرگز نہ ہو کہ تم بھی انہیں کے زمرے میں شامل ہو جاؤ اور یہ یاد رکھو کہ جب تک تم خدا سے ڈرتے رہو گے، یہ لوگ تم سے ڈرتے رہیں گے۔")

یہی رائے آپ کی زبان سے اس وقت بھی ظاہر ہوئی جب آپ نے محسوس کیا کہ بعض مہاجرین میں خلافت کی طمع پائی جاتی ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف جب آپ کی عیادت کے لئے آپ کے پاس آئے تو آپ نے فرمایا:-

"اے مہاجرین! مجھے جو تکلیف تمہارے رویہ سے ہوئی ہے وہ میری بیماری سے بھی زیادہ شدید ہے۔ میں نے تم میں جس شخص کو بہتر پایا اُس کے حوالے معاملات کی باگ ڈور کر دی۔ اس پر تم لوگوں کی ناک بھوں چڑھی ہوئی ہے۔ گویا تم میں کا ہر شخص اس بات کا خواہشمند ہے کہ یہ منصب اس کو ملنا چاہیے تھا۔ تم نے دنیا کو اپنی طرف آتے دیکھا حالانکہ وہ ابھی تم تک پہنچی ہی نہیں ——

—— تم اس پر ریجھ گئے تاکہ ریشم کے پردے اور دیباج کے گدّے بنا سکو اور تاکہ آذربائی جانی صوفوں پر لیٹ کر عیش وعشرت کرو۔ اور تم کو وہ تکلیف نہ ہو سکے جو کانٹے دار گھاس پر سو کر اس وقت ہوتی ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اگر بغیر کسی گناہ کے تمہاری گردن مار دی جائے تو یہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ تم لذاتِ دنیا میں کھوئے رہو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو لوگوں کی گمراہی کی ذمہ داری سب سے پہلے تم پر ہو گی۔ اس لئے ان کو صحیح راستے سے نہ بھٹکاؤ۔"

یہ کلام ایسے ہی شخص کا ہو سکتا ہے جس کو اپنے قول کی صداقت کا یقین ہو اور جس نے اپنی رائے کسی اور سے اخذ نہ کی ہو بلکہ بذاتِ خود اس فیصلہ پر پہنچا ہو۔

اس لئے یہی کہنا پڑے گا کہ اس راستے کے نشیب و فراز کو دونوں ہی حضرات اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اور اس کی صحت کا یقین کامل بھی دونوں ہی حضرات کو حاصل تھا۔

یہ پُر مغز نصائح جو وفات کے وقت کئے گئے حضرت ابو بکرؓ کی زندگی سے پردہ اٹھا کر وہ راز ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں جو طول طویل واقعات کھنگالنے کے بعد بھی ہمارے سامنے نہیں آتا۔ یہ نصائح اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ نے اپنی زندگی ان خطوط پر گذار دی جن پر وہ خود صحابہ کو چلانا چاہتے تھے۔ اور جن پر چلنے کی حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور حضرت عمرؓ بن خطاب جیسے عظیم المرتبت صحابہ کو ترغیب دلاتے رہے۔ یہ طرز زندگی جس شخص کا معمول بن چکا ہو وہی اس طرح کی نصیحت کر سکتا ہے اور وہی اس قابل ہو سکتا ہے کہ اس عظیم پائے کے وہ صحابی اس کی نصیحت سنیں۔

اسی طرز زندگی نے عام اور خاص صحابہ میں حضرت ابو بکرؓ کو اتنی عظمت بخش دی تھی۔ اس عظمت کا استحقاق ان کو اس لئے پہنچا کہ وہ اسلام لانے میں پیش پیش تھے۔ نبیؐ کی صحبت سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے میں مستعد رہتے تھے اور وقار و عظمت پیدا کرنے کے لئے ہر مشقت و ریاضت کر گذرتے تھے۔ یہاں تک کہ تعظیم و توقیر نے ان کے قدم چوم لئے۔

حضرت ابو بکرؓ کے علاوہ کسی اور کے بس کی یہ بات نہ تھی کہ وہ حضرت

عمرؓ کو اس وقت ٹھنڈا کر سکے جب وہ رسول اللہ کی وفات کی خبر سن کر آپے سے باہر ہو گئے تھے۔ اور حضرت ابو بکرؓ کے علاوہ کسی اور کے بس میں یہ بھی نہ تھا کہ وہ حضرت عمرؓ کو اس وقت خاموش رکھ سکتا جب کہ وہ سقیفہ بنی ساعدہ میں تقریر کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے ان کو اس وقت اس لئے خاموش نہیں کر دیا کہ وہ خلیفہ تھے۔ خلافت کا مسئلہ ابھی بیچ ہی میں تھا اور اگر وہ خلیفہ ہوتے جب بھی کوئی فرق نہ واقع ہوتا۔

حضرت عمرؓ ان لوگوں میں سے نہیں تھے کہ کسی منصب کی ہیبت اور اقتدار کی سطوت سے مرعوب ہو جائیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک باوقار انسان کی بات ایک مرد حق پرست نے سنی اور خاموش ہو گیا۔

جس انسان کے سامنے حضرت عمرؓ بن خطاب جیسے شخص نے اپنی سپر ڈال دی تھی، وہ اس بات کا سزاوار تھا کہ دوسرے تمام صحابہ بھی اس کی تمکنت کے آگے جھک جائیں۔

تہذیبی زندگی

ایک مہذب شخص کی تہذیبی زندگی میں بہت سی علامات پائی جاتی ہیں، جو اس کے تہذیبی مقام کی غماز ہوتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ان علامات میں غور و فکر اور وسیع مطالعہ و تحقیق کو بھی دخل ہو۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ان کے اندر اس دور کی تہذیب و ثقافت کا اثر موجود ہو۔

یہ علامات اپنی قدر و قیمت اور اہمیت کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قیمتی، قابل قدر اور اہم انسان کا خود اپنا کلام اور سخن فہمی ہے۔ کلام انسان کی نفسیاتی اور ذہنی برتری کا پرتو ہوتا ہے اور اس سے آدمی کی عقل و دانش اور علم و عرفان پر گہری روشنی پڑتی ہے کیسی انسان کے کلام کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر لینا اس کے جملہ احوال و افعال کا اندازہ کر لینے کے لئے کافی ہے۔

حضرت ابو بکرؓ کی تہذیبی زندگی کی بھی نمایاں علامت خود آپ کا کلام

اور آپ کی سخن شناسی ہے۔ آپ کی زبان سے جو بات بھی نکلتی تھی پورے غور و فکر کے بعد۔ اسی بنا پر ہم ان کے اندر جلد بازی، اوچھے پن، سطحیت اور عدم تدبر کا ادنیٰ شائبہ بھی نہیں پاتے۔ آپ دوسروں کے مقام و منزلت کا اندازہ ان کی گفتگو اور بات چیت سے لگا لینے میں بھی بڑا ملکہ رکھتے تھے۔ آپ خود بھی مختصر گفتگو فرمایا کرتے اور اپنے گورنروں اور حکام کو بھی اختصارِ کلام کی نصیحت کرتے بخالدؓ بن ولید سے فرمایا۔

"گفتگو میں اختصار سے کام لو۔ کلام اتنا ہی مفید ہوتا ہے جتنا آسانی سے سنا جا سکے۔"

یزید بن ابوسفیان سے فرمایا۔

"لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے وقت اختصار برتو۔ طول کلامی گفتگو کا کچھ حصہ ذہنوں سے ضائع کر دیتی ہے۔"

فرمایا کرتے کہ:۔

"مصیبت کی جڑ کی بنیاد انسان کی گفتگو ہے۔"

آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر ایک سے زیادہ گہرا تعلق تھا اور آپ حضورؐ کی صحبت سے استفادہ کرنے میں بھی ہر ایک سے پیش پیش تھے لیکن اس کے باوجود آپ کی زبانی ایک سو چالیس یا اس سے کچھ ہی زیادہ احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے صرف سات احادیث بخاری اور مسلم

نے ثابت کی ہیں۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ آپ تدوین حدیث کے دور سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ اس لئے آپ کی روایت کردہ احادیث قلمبند ہونے سے رہ گئیں۔ لیکن یہ توجیہہ اس لئے صحیح نہیں کہ بہت سے دوسرے صحابہ بھی دورِ تدوین سے پہلے وفات پا چکے تھے مگر ان سے بے شمار احادیث مروی ہیں ہمارا خیال یہ ہے کہ آپ کی قلت روایت کا سبب کم گوئی ہے۔

یہ ایک عمومی جائزہ ہے آپ کے کلام اور سخن فہمی کا اس حیثیت سے کہ کلام ایک نفسیاتی ملکہ اور انسانی شخصیت کا جزو ہے۔

اب ذرا آپ کے کلام کا خصوصی جائزہ بھی لے لیجئے۔ اور یہ بھی دیکھتے چلئے کہ آپ کس پائے کے سخن شناس تھے۔ تحقیق و تفتیش کے اس کوچہ میں جب آپ قدم رکھیں گے تو آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ آپ کا کلام ہر میزان میں بھاری ہے۔ بلاغت کی میزان ہو، عادات و اطوار کی میزان ہو، حکمت و موعظت کی میزان ہو، غرض جو میزان بھی ہو، آپ کے کلام کا وزن ہر جگہ بھاری نظر آئے گا۔

آپ کے کلماتِ جامعہ کی جو نادر اور انوکھی مثالیں ہمیں ملتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کہنے والے کے غیر معمولی ملکہ کا ثبوت فراہم کرتی ہے اور ان میں سے قلیل سا حصہ بھی "مشتے نمونہ از خروارے" کے مصداق آپ کے پورے کلام کا آئینہ دار ہے۔

آپ کے کلام کے مذکورہ ذیل ٹکڑے ملاحظہ فرمایئے اور یہ اعتراف کیجئے کہ

ان کا سرچشمہ نفس کی گہرائی اور گیرائی کے سوا کچھ نہیں۔

"موت سے محبت کرو تو زندگی عطا کی جائے گی۔"

"سب سے بڑی صداقت امانت ہے اور سب سے بڑا جھوٹ خیانت ہے۔"

("بہترین خصلت وہ ہے جو تم پر گراں گذرے۔")

("صبر نصف ایمان اور یقین پورا ایمان ہے۔")

("اگر کوئی نیکی کسی وجہ سے رہ جائے تو اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اگر اسے پالو تو آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔")

("مشیر سے اپنی بات چھپا کر نہ رکھو ورنہ اپنی قبر اپنے ہاتھ سے کھودنے کے مرتکب ہوگے۔")

("تعزیت و غم خواری کے بعد مصیبت مصیبت نہیں رہ جاتی۔")

یہ اور اسی قسم کا دوسرا کلام آپ کے اعتدال فکر و نظر، بلاغت اور حسنِ تعبیر کا مرقع ہے۔ یہ اصل سرچشمہ کا بھی پتہ دیتا ہے اور تہذیب و شائستگی کی ان علامات و خصوصیات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے جن کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا باعثِ افتخار سمجھا جاتا ہے۔

آپ بلاغتِ کلام اور مہارتِ سخن کے ساتھ ساتھ خطابت کا ملکہ بھی اپنے اندر رکھتے تھے۔

حضرت عمرؓ کے ایک بچہ کی موت پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے فرمایا

"اللہ تعالیٰ آپ کو اس (بچہ) کی طرف وہی اجر عطا فرمائے جو اجر اُس نے اس (بچہ) کو آپ کی طرف سے عطا فرمایا ہے۔"

ایک آدمی کچھ کپڑے اٹھائے جا رہا تھا۔ اس سے پوچھا "کیا تم یہ کپڑا فروخت کر رہے ہو؟"

اُس نے جواب دیا "نہیں! خدا آپ کو معاف کرے۔"

آپ نے فرمایا "تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ نہیں! اور خدا آپ کو معاف کرے" اس کو کہتے ہیں سخن شناسی، سخن سنجی! عبارت میں توازن و شگفتگی، کلام میں وزن اور خطابت کا منجھا ہوا ذوق۔ اگر کوئی مہذب نفس اپنی کسی ذاتی خصوصیت کی بناء پر امتیازی مقام حاصل کر سکتا ہے تو اس کی اعلیٰ اور ارفع خصوصیت یہ ہے۔

جو شخص خطابت و بیان پر اتنی زبردست قدرت رکھتا ہو، اس کا دوسروں کے کلام میں اس فن کے شواہد و خصوصیات ڈھونڈھنا فطری امر ہے۔ آپ کے یہاں اتنی غیر معمولی بیانیہ قدرت شاید اس لئے تھی کہ آپ اس کی فطری صلاحیتا سے متصف تھے۔ اسی بنا پر بلغاء و فصحاء اور خطباء و شعراء کا کلام کھنگالنے کے عادی ہو گئے۔ آپ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ دوران کلام کثرت سے شعر پڑھتے، امثال بیان کرتے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اشعار کے وزن وغیرہ کے متعلق استفسار فرماتے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کو جو اشعار اور خطبے

یاد تھے وہ ان کو آپ ہی سے وراثت میں ملے تھے۔ آپ کے خاندان میں سخن سنجی کو جو فروغ حاصل ہوا وہ بھی آپ ہی کی بدولت۔ چنانچہ آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ اور حضرت عبدالرحمٰن دونوں کوچہ شعر کے رہ نوردتھے۔ ان کے اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔ ثقہ روایات کے مطابق آپ نے خود کبھی شعر نہیں کہا لیکن سخن فہمی اور اشعار حفظ ہونے کی وجہ سے آپ کو شعر سے قریبی نسبت تھی

آپ کی تہذیبی زندگی کا یہ پہلو اس تہذیب و ثقافت کا اثر تھا جو اس دور میں جزیرہ نمائے عرب میں رائج تھی۔ طبع سلیم، زرخیز فکر و نظر، سیرو سیاحت اور دنیوی معاملات سے حاصل کیے ہوئے تجربات، شستہ اور مختصر کلام کا رواج انساب و تواریخ کا علم، قرآن کا استیعابی مطالعہ، دین کا فہم کامل اور صاحب قرآن سے پوچھ کر اور سن کر وریائے معانی میں اتر جانا، یہ تمام چیزیں آپ کی زندگی کے اس پہلو پر اثر انداز تھیں۔

ایک دن یہ آیت پڑھی۔

یا ایھا الذین آمنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم۔

اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ تم پر بس تمہاری ذمہ داری ہے۔ اگر تم ہدایت پر ہو گے تو گمراہ لوگوں سے تم کو کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔

اور فرمایا، لوگ اس آیت کو بے محل استعمال کرتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ "لوگ جب ظالم کو ظلم کرتے دیکھیں اور اس
ہاتھ نہ پکڑیں، برائی کو دیکھیں اور اس کو بدل نہ دیں تو اللہ تعالیٰ اس جرم کی
سب کے لئے عام کر دیتا ہے"

ایک دن اپنے ساتھیوں سے فرمایا "کیا مطلب سمجھے ہو تم لوگ ان دونوں
آیتوں کا؟"

۱۔ ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا فلاخوف علیھم ولاھم یحزنون۔	بلاشبہ جن لوگوں نے کہا۔ ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر استقامت دکھائی۔ انہیں نہ کوئی خوف ہے نہ غم۔
۲۔ والذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم۔	وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے خلط ملط نہیں کیا۔

لوگوں نے ان دونوں آیتوں کا یہ مطلب بیان کیا کہ "جن لوگوں نے اپنے ایمان
کو غلط کاری سے ملوث نہ کیا"

آپ نے فرمایا "تم لوگوں نے کچھ من بھاتی تو جیہہ نہ کی۔ اس آیت کا
مطلب یہ ہے کہ "جن لوگوں نے استقامت دکھائی اور اپنے ایمان کو شرک
سے ملوث نہ کیا"

قرآن کی موجودگی ہی وہ اصل منبع تھی جس سے حضرت صدیقؓ کے پاکیزہ اور اعلیٰ ذوق نے سیرابی حاصل کی تھی۔

(اس دور کی سیاست کے لحاظ سے آپ ایک بلند پایہ فقیہہ، ایک بے مثال ادیب اور ایک اعلیٰ درجہ کے مورخ تھے۔)

آج ہم تاریخ کو جن معنوں میں لیتے ہیں وہ اگرچہ اس دور کے معنی و مفہوم سے مختلف ہے لیکن علم انساب جس میں حضرت ابو بکرؓ کو غیر معمولی مہارت حاصل تھی، ایسا علم ہے جو عرب قوم کے جملہ محاسن و معائب پر محیط ہے۔ علم تاریخ سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ انسان میں بلند سے بلند تر مقام تک پہنچنے کا شوق و ولولہ پیدا ہو۔ نیک کام کرنے کی امنگ پیدا ہو اور مذموم افعال سے اجتناب و پرہیز کی روح بیدار ہو۔ علم انساب سے یہ تمام فوائد اس دور میں بدرجۂ اتم حاصل ہوتے تھے۔

دعوت اسلامی کے ابتدائی دور میں ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبائل کے سامنے اسلام پیش کرنے کی غرض سے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ کو ساتھ لے کر باہر نکلے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک مجلس میں پہنچے۔ حضرت ابو بکرؓ آگے بڑھے اور وہ نیکی کے ہر کام میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔ آدمی ماہر انساب تھے۔ لوگوں سے پوچھا۔ حاضرین کا تعلق کس قبیلہ سے ہے؟"

لوگوں نے کہا "ربیعہ سے۔"

فرمایا "کس ربیعہ سے؟ ذہلات ربیعہ سے یا لہازم ربیعہ سے؟"

جواب دیا گیا "ربیعہ کے ہامۂ عظمیٰ سے۔"

فرمایا "کون سا ہامۂ عظمیٰ؟"

لوگوں نے جواب دیا "ذہل اکبر۔"

فرمایا "کیا تمہیں میں سے عوف بن محلم تھا جس کے متعلق مشہور ہے کہ عوف کی وادی میں کوئی شخص آزاد نہیں رہا۔"

لوگوں نے جواب دیا "نہیں۔"

فرمایا "کیا تمہیں میں مزدلف آزاد گذرا ہے جس کا عمامہ ہر ایک سے مختلف ہوا کرتا تھا؟"

لوگوں نے کہا "نہیں۔"

فرمایا "کیا تمہیں میں بسطام بن قیس گذرا ہے جو بابائے ضیافت اور مادرِ افلاس کے لقب سے مشہور ہے؟"

لوگوں نے کہا "نہیں۔"

فرمایا "کیا تمہیں میں جساس بن مرہ گذرا ہے جو عہد و پیمان کا محافظ اور پڑوسی کا نگہبان تھا؟"

لوگوں نے کہا "نہیں۔"

فرمایا: کیا تمہیں میں حوفز نام کے وہ دونوں انسان گذرے ہیں جو بادشاہوں
کو قتل کیا کرتے اور ان کو لوٹا کرتے تھے؟
لوگوں نے کہا: "نہیں"
فرمایا: "کیا تمہیں میں وہ لوگ ہو گذرے ہیں جن کے کنڈی بادشاہوں سے
رشتے ناطے تھے؟"
لوگوں نے کہا: نہیں"
فرمایا: کیا تمہیں میں وہ لوگ ہو گذرے ہیں جن کے لخمی بادشاہوں سے
رشتے ناطے تھے؟"
لوگوں نے کہا: نہیں"
فرمایا: "پھر تم ذہل اکبر سے نہیں، ذہل اصغر سے ہو"
اتنی وسیع معلومات تھیں حضرت ابوبکرؓ کو ہر قبیلہ وخاندان ——
بالخصوص قریش اور ان سے قریبی تعلق رکھنے والوں —— کے انساب
اور اس کے معائب و محاسن کے متعلق۔
یہی وجہ ہے کہ جب مسلمان شعرا مشرکین کی ہجو کرتے تو وہ یہ کہتے کہ یہ
ابن ابی قحافہ کی کارستانی ہے اور انہیں کے ایما پر یہ چوٹ کی گئی ہے۔
ہم یہ نہیں سمجھتے کہ کوئی بھی انسان جن کو اتنے ہی اور ایسے مواقع حاصل
ہوں وہ تہذیب و ثقافت کے اس مقام پر فائز ہو سکے گا جس مقام پر حضرت

ابوبکرؓ اپنے اعمال و اقوال اور عادات و خصائل کی بدولت فائز ہوئے۔ اور آپ کا یہی مقام ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ آپ کا ضمیر عظمت و امتیاز کے امتزاج سے اٹھا تھا اور آپ عام انسانوں جیسے ایک انسان نہ تھے۔

حضرت صدیقؓ کی زندگی کے مختصر جائزے کے بعد ہم نہایت آسانی سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ آپ گھریلو یا خاندانی قسم کے آدمی تھے اور یہ کہ آپ کے تعلقات صرف گھر کی حد تک ہی محدود نہ تھے۔ بلکہ محبت و مودّت اور انس و الفت کا فیض عام تھا۔

آپ صرف ایک اطاعت گذار بیٹے ہی نہ تھے کہ والدین کی اطاعت تو بہر حال فرض ہے۔

آپ صرف ایک شفیق باپ ہی نہ تھے کہ بچوں کے ساتھ شفقت سے پیش آنا طبعی امر ہے۔

آپ صرف ایک باوفا شوہر ہی نہ تھے کہ وفاداری تو بہر حال بیوی کا حق ہے۔

بلکہ آپ اپنے جملہ تعلقات و روابط اسی رنگ میں نباہتے۔ اپنے

ابنائے مجلس میں موجود رہ کر فرحت و خوشی محسوس کرتے۔ دوستوں اور ہم
نشینوں کی فضا میں ایک طرح کی راحت پاتے۔ غرض آپ ایک مثالی قسم
کے مجلسی آدمی تھے۔

آپ دورِ جاہلیت میں بھی والدین کی اطاعت شعاری میں مشہور تھے
جب اسلام آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیض پانے
کا موقع ملا تو فطری اطاعت شعاری نے ترقی کر کے فرض کی صورت اختیار
کر لی اور آپ کو اس فرض اطاعت شعاری میں وہی سکون و راحت محسوس
ہونے لگی جو ایک انسان کو جزائے اُخروی کی امید میں محسوس ہوا کرتی ہے۔
آپ کا لطف و کرم اولاد کے ساتھ بھی پوری زندگی یکساں قائم رہا
اور اس میں کبھی کوئی فرق نہ آیا۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی عقیدے یا تادیب
کے جذبے نے اس کے برخلاف روش اختیار کرنے پر مجبور کیا ہو۔ آپ کے
ایک صاحبزادے نے جو جنگِ بدر میں مشرکین کے ساتھ تھے آپ سے عرض کیا
کہ "آپ بدر کے میدان میں میرے سامنے کئی دفعہ آئے اور میں گریز کر گیا"
آپ نے فرمایا: "اگر تم میرے سامنے آجاتے تو میں تم کو ہرگز نظر انداز
نہ کرتا"۔

(ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ سے کسی بات میں اختلاف کیا
حضورؐ نے فرمایا: تم کس کو حکم بنانا پسند کرو گی۔ کیا ابو عبیدہ بن جراح کی ثالثی

پر رضامند ہو؟"

حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: "نہیں! وہ نرم مزاج ہیں اس لئے آپؐ کے حق میں فیصلہ کردیں گے۔"

آپؐ نے فرمایا: "پھر اپنے باپ کو حکم بنانا پسند کروگی؟"

حضرت عائشہؓ نے رضامندی ظاہر کردی۔

جب حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے تو رسولؐ اللہ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: "قضیہ تم بیان کرو۔"

حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: "نہیں! بلکہ آپؐ خود ہی بیان فرمائیے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قصہ بیان فرمانا شروع کیا۔ اس دوران حضرت عائشہؓ کی زبان سے آپ کی شان میں ایک نامناسب فقرہ نکل گیا فرمانے لگیں کہ اصل بات میں اضافہ نہ کیجئے۔ حضرت صدیقؓ کو یہ سن کر غصہ آگیا اور انہوں نے حضرت عائشہؓ کے طمانچہ رسید کردیا۔

پھر فرمایا کہ "اے بنتِ رومان! تم میں یہ جرأت کہ آنحضرتؐ کی شان میں ایسا نامناسب لفظ استعمال کرو۔ اگر رسولؐ اللہ انصاف سے کام نہیں لیں گے تو اور کون ایسا کرے گا؟"

حضرت عائشہؓ کی ناک سے خون جاری ہوگیا۔ اور آنحضرتؐ نے بیچ میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کردیا۔ اور اپنے دوست سے فرمایا: "ہمارا یہ مطلب نہ تھا۔"

اس کے بعد حضرت صدیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اذن لے کر واپس چلے گئے اور حضورؐ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا "تم نے دیکھا، خدا نے تم کو کس طرح بچا لیا"

اس قسم کے مواقع پر حضرت ابو بکرؓ اپنی اولاد پر سختی کر گذرتے تھے مگر اس سختی میں نرمی اور شفقت کا پہلو ضرور ہوتا یہی وجہ ہے کہ اس کا اثر دیر تک نہ رہتا بلکہ موقع گذر جانے کے بعد زائل ہو جاتا۔

آپ کے اندر پدرانہ شفقت کا اتنا سچا اور حیرت انگیز جذبہ تھا کہ بچے کو عہدِ طفلی میں جو ضروریات پیش آتی ہیں ان کو بروقت محسوس فرمالیتے اور ان کو پورا کرنے کے لیے جو سامان درکار ہوتا فوراً مہیا کر دیتے۔ اگرچہ بعض اوقات اس سلسلے میں خاطر احباب کے نازک آبگینوں کو ٹھیس بھی پہنچانی پڑتی چنانچہ جب عمر بن خطابؓ نے اپنے بچے عاصم کو اپنی مطلقہ بیوی سے واپس لینا چاہا تو ماں نے حضرت ابو بکرؓ کے پاس حضرت عمرؓ کے خلاف چارہ جوئی کی۔ آپ نے یہ فیصلہ دیا کہ بچہ اپنی ماں کے پاس رہے گا۔ اور حضرت عمرؓ سے فرمایا "بوسے ملاطفت اور لطفِ امومت بچے کے لیے تم سے بہتر ہے"

اس طرح گویا آپ نے ایک ہی وقت میں رحمت و شفقت کی غرض و غایت بھی پوری کر دی اور عدل و انصاف کا تقاضا بھی پورا کر دیا۔ جو انسان حضرت عمرؓ جیسے صاحبِ جلال شخص کے مقدمے میں بھی عدل و انصاف کا دامن

نہ چھوڑے اُس کو نظام عدالت کا وہ کون سا فخر ہے جو نہیں حاصل ہونا چاہیئے؟

دوستی آپ کے نزدیک اخوت و نبوت کا درجہ رکھتی تھی۔ ایک دن حضرتؓ عمرؓ کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے فرمایا (" واللہ! عمرؓ مجھے تمام لوگوں سے زیادہ عزیز ہے۔")

پھر گرد وپیش کے لوگوں سے پوچھا (اور انہیں میں حضرت عائشہؓ بھی موجود تھیں) کہ "میں نے کیا بات کہی؟"

شاید اس اندیشہ سے کہیں مبالغہ نہ ہو گیا ہو۔ حضرت عائشہؓ نے جو کچھ سنا تھا، دہرا دیا۔ آپ نے یہ سن کر اپنی پہلی بات میں اتنا اور اضافہ کر دیا ("سوائے اولاد کے۔ اولاد کا دل سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔")

حضرت صدیقؓ نے دو شادیاں زمانہ جاہلیت میں اور دو زمانہ اسلام میں کیں۔ ان بیویوں میں سے ایک ام رومانؓ تھیں جن سے حضرت عبدالرحمٰن اور حضرت عائشہؓ پیدا ہوئیں۔ دوسری حبیبہ بنت خارجہ تھیں۔ جو آپ کی وفات کے وقت حمل سے تھیں۔ ان سے وفات کے بعد ام کلثوم پیدا ہوئیں۔ آپ کے ایک صاحبزادے عبداللہ تھے جو ہجرت مدینہ کے وقت دشمنوں کی خبریں آپ کے پاس لایا کرتے تھے۔ یہ طائف میں زخمی ہوئے اور اسی زخم کے باعث کچھ عرصہ بعد جاں بحق ہو گئے۔

یہ بہادر، ادیب، شاعر اور رقیق القلب قسم کے آدمی تھے۔ ان کے کچھ

نہایت حسین و رنگین اشعار ان کی مطلقہ بیوی عاتکہ بنت زید کے متعلق مروی ہیں۔ ان کے جو قصے حضرت عاتکہ سے متعلق مشہور ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ ابوت، زوجیت اور فرض تینوں ذمہ داریوں کا بیک وقت کتنا متوازن شعور و احساس رکھتے تھے۔

حضرت عاتکہ حسن و جمال اور ذہانت و فطانت میں یکتائے زمانہ تھیں۔ حضرت عبداللہؓ ان پر دل و جان سے فریفتہ ہوگئے اور رفتہ رفتہ عشق و وارفتگی اور بے خودی کی منزل میں داخل ہوگیا۔ باپ نے یہ حالت دیکھ کر طلاق کا مشورہ دیا۔ انہوں نے تعمیل ارشاد کرتے ہوئے طلاق تو دے دی مگر فراق کا غم برابر ستاتا رہا اور اس سوز و گداز نے شعروں کا روپ دھار لیا۔ اس ضمن میں ان کے مذکورہ ذیل اشعار کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

اعاتک لا انساک ماذر شارق

وما لاح نجم فی السماد محلق!

"اے عاتکہ! جب تک آفتاب ضیا بار رہے گا اور جب تک آسمان میں گردش کرنے والا ستارہ نمودار ہوتا رہے گا، میں تمہیں فراموش نہیں کر سکتا۔"

اعاتک قلبی کل یوم ولیلۃ!

لدیک بما تخفی النفوس معلق!

"اے عاتکہ! میرا قلب سوزِ دروں کے باعث شب و روز تیرے پاس

اٹکا رہتا ہے۔

لہا خلق جزل ورای و منصب
و خلق سوی فی الحیاء مصدق

اس کا کیرکٹر، دانش اور مرتبہ بہت اونچا ہے اور باحیاء ہونے میں بھی اس کا راست کردار مسلم ہے۔

ولم ار مثلی طلق الیوم مثلہا!
ولا مثلہا فی غیر شئی تطلق!

میں نے اس دن اپنے جیسا بدنصیب نہیں دیکھا جس دن اس جیسی کو طلاق دی گئی اور نہ اس جیسی بے قصور کسی کو پایا جس دن اس کو بلا وجہ طلاق دی گئی۔

باپ نے یہ حالت دیکھی تو نہ رہا گیا اور مراجعت کا حکم دے دیا۔ چنانچہ عبداللہ نے مراجعت کرلی۔ حضرت ابوبکرؓ کا کردار اس موقع پر حضرت عمرؓ کے کردار کے عین متقابل نظر آتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح دوسری عادات واطوار میں دونوں حضرات کا کردار بالکل متوازی چلتا رہتا تھا حضرت عمرؓ نے اپنے صاحبزادے پر اظہار افسوس کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ یہ تو اپنی بیوی کو طلاق دینی بھی نہیں جانتا۔ اور جب لوگوں نے ان کا نام خلافت کے لیے پیش کیا تو حضرت عمرؓ نے اسی واقعے کو اس کی عدم صلاحیت کی دلیل بنا

کر پیش کیا۔

حضرت ابوبکرؓ کی بیویوں کو کبھی آپ سے کوئی شکایت نہیں پیدا ہوئی البتہ نفقہ میں کمی اور کفایت شعاری کا شکوہ ضرور رہا۔ جس دن ازواج مطہرات آنحضرتؐ سے نفقہ بڑھانے کا مطالبہ کر رہی تھیں، اتفاق سے اسی دن بنت خارجہ بھی حضرت ابوبکرؓ سے یہی مطالبہ کر رہی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ کو اس بات پر غصہ آگیا اور آپ رسول اللہؐ کے پاس تشریف لے گئے تاکہ حضورؐ کے سامنے واقعہ بیان کر کے اپنی پریشانی دور کریں۔ جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ امہات المومنین بھی اسی حالت میں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا پہلے سے باہمی معاہدہ ہو چکا ہو۔

حضرت ابوبکرؓ نہ مفلس تھے اور نہ مال و دولت جمع کرنے سے عاجز تھے آپ نے اسلام کی راہ میں چالیس ہزار نقد رقم خرچ کی اور غریبوں اور ناداروں میں کھانا کپڑا بھی عمر بھر تقسیم فرماتے رہے۔ بالخصوص قحط کے زمانہ میں۔ لیکن خود اپنے معاملہ میں متاع روحانی کو متاع دنیا پر ترجیح دی۔ اور یہ بات کبھی گوارا نہ کی کہ اپنے گھر میں اپنے نبیؐ اور دوست سے بہتر زندگی گذاریں۔ آپ کو اسراف اور فضول خرچی سے نفرت تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ

"میں ایسے گھر والوں کو پسند نہیں کرتا جو کئی دنوں کا رزق ایک ہی دن میں خرچ کر ڈالیں۔"

اگر آپ کے پاس مال کی فراوانی ہوتی جب بھی اپنے متعین معیار سے تجاوز نہ فرماتے۔ نبیؐ کا اسوہ و نمونہ اس معاملہ میں ہمیشہ پیش نظر رہتا۔ اور خواہش یہ ہوتی کہ آپ اپنے ساتھیوں اور بعد میں آنے والوں کے لیے خود بھی مثالی قائم کر جائیں۔

خلافت کا منصب سنبھالنے کے بعد آپ کا جو وظیفہ مقرر کیا گیا اس کے متعلق متعدد قسم کی روایات ملتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابوعبیدہؓ اور چند دوسرے صحابہ کبار کے مشورہ سے اس وظیفہ کا تقرر عمل میں آیا تھا۔ ان ساری روایات میں ایک بات مشترک اور متفق علیہ ملتی ہے۔ وہ یہ کہ آپ اپنی خانگی زندگی میں حد درجہ کفایت شعار رہے اور اسراف سے ہمیشہ مجتنب رہے۔

آپ کا خود اپنے متعلق ارشاد ہے کہ "میں نے سدِ رمق اور ستر پوشی کی حد سے کبھی تجاوز نہیں کیا۔"

وفات ہوئی تو کوئی قابل ذکر اثاثہ پیچھے نہیں چھوڑا۔ حضرت عمرؓ کے مذکورہ ذیل الفاظ اس ضمن میں قابل ملاحظہ ہیں۔

"خدا حضرت ابوبکرؓ پر رحمتوں کی بارش کرے۔ انہوں نے اپنے بعد والوں کو مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے"

حضرت عمرؓ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ نے ایسا اسوہ چھوڑا ہے کہ جس کی اتباع

بعد والوں کے لئے آسان نہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کی گھریلو زندگی کی جتنی مکمل تصویر آپ کی دونوں صاحبزادیوں حضرت عائشہؓ اور حضرت اسماءؓ کے مطالعہ سے سامنے آسکتی ہے اتنی جامع تصویر کہیں اور سے دستیاب نہیں ہو سکتی۔

حضرت عائشہؓ نے دس سال یا اس سے کچھ ہی زیادہ عمر میں اپنے باپ کا گھر چھوڑا جیسا کہ مورخین نے بہت سے تاریخی واقعات کا موازنہ کر کے ثابت کیا ہے۔

اتنی کم عمر میں بھی ان کو بے شمار اشعار و امثال اور خطبے زبانی یاد تھے اور نادر واقعات و حادثات تک بڑی وسیع معلومات ان کو حاصل تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کے کلام اور آپ کی صحبت نے ان میں اور زیادہ پختگی پیدا کر دی۔ چنانچہ وہ بعد میں فقہ و سنت کے معاملات میں مرجع خلائق بن گئیں جن میں صحابۂ کبار بھی شامل ہیں۔

بعض لوگ یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ حضرت عائشہ نے اپنے شوہر کی نگاہ میں جو مرتبہ و مقام حاصل کیا اپنے حسن و جمال، کم سنی اور شوہر سے باپ کی دوستی کی بدولت۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کو آنحضرت ﷺ کے نزدیک یہ مرتبہ و مقام اس لئے حاصل ہوا کہ وہ ایک لائق بیوی ہونے کی حیثیت سے اسی مقام و مرتبہ کی مستحق تھیں۔ ازدواجی آداب و اطوار سے وہ خوب واقف تھیں۔ اور یہ جانتی

تھیں کہ شوہر کی رضامندی و خوشنودی حاصل کرنے اور اس کے دل میں جگہ پیدا کرنے کے لئے کن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

ایک روایت میں جو مختلف طریقوں سے مروی ہے آتا ہے کہ ایک دن جب کہ تپش جوبن پر تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جوتیاں گانٹھ رہے تھے۔ پسینہ جبینِ مبارک سے نکل کر رخساروں پر بہہ رہا تھا۔ حضرت عائشہ رض قریب ہی کھڑی آنحضرت صلعم کو اس انداز سے دیکھ رہی تھیں جس اندازِ محبت سے ایک بیوی ایسی کیفیت میں شوہر کو دیکھا کرتی ہے۔

آپ نے نگاہ اٹھائی تو حضرت عائشہ رض کو اس انداز میں کھڑے پاکر فرمایا "تم کچھ حیران نظر آتی ہو۔"

حضرت عائشہ رض نے عرض کی "اگر ابو کبیر ہذلی آپ کو اس حالت میں دیکھ لیتا تو سمجھتا کہ اُس کے قول کے مصداق آپ ہی ہیں۔"

آپ نے دریافت فرمایا "اُس نے کیا کہا ہے؟"

حضرت عائشہ رض نے عرض کیا "وہ کہتا ہے کہ

ومبرأ من کل غبر حیضة

فساد مرضعة وداء مغیل

وہ حیض کی آلودگی سے پاک اور مرضعہ (دودھ پلانے والی عورت) کے شیر فاسد اور حاملہ کے بیمار دودھ سے محفوظ ہے۔ (عربوں کے یہاں یہ خیال عام

تھا کہ جو بچہ غیر حالتِ حیض میں جماع کے بعد پیدا ہو اور جس کو پرورش کے دوران حاملہ عورت کا دودھ نہ پینا پڑے وہ آئندہ چل کر ہونہار ثابت ہوتا ہے)

واذا نظرت الی اسرۃ وجہہ!

برقت بروق العارض المتہلل!

اگر تم اس کے چہرے کے خطوط کی طرف دیکھو تو ایسا نظر آئے گا جیسے چمکنے والے ابر میں بجلیاں کوند رہی ہوں۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنا تو فرطِ انبساط سے اٹھ کر حضرت عائشہؓ کو چوم لیا اور فرمایا "تم نے مجھے خوش کر دیا۔ خدا تمہیں خوش رکھے"۔

یورپین ناقدین حضرت عائشہؓ کو جس رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ وہ تصویر ان کے حقیقی روپ سے یکسر مختلف ہے۔ یہ حضرات اپنے قارئین کے سامنے حضرت عائشہؓ کی جو تصویر پیش کرتے ہیں وہ ایک گڑیا سے قطعاً مختلف نہیں جو ایک بڑے انسان کے دل بہلانے کا ذریعہ تھی۔ ان کی نگاہ میں میاں بیوی کی عقل و دانش میں کوئی تناسب نہ تھا۔ مگر ہم اس کو صریح زیادتی سمجھتے ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ ایسی بیوی تھیں جو اپنے شوہر کے گھریلو معاملات میں اس کی برابر کی شریک و سہیم ہوتی ہے۔ ایسی عورت تھیں جو مرد سے تبادلہ احساس و شعور کرتی ہے۔ اور ایسی شاگرد تھیں جو ایک عظیم استاد سے درس لیتی اور اس میں پختگی پیدا کرتی ہے۔ غرض حضرت عائشہؓ ہر پہلو

سے حضرت صدیقؓ کے گھریلو ماحول کا مکمل نمونہ تھیں۔

حضرت اسماءؓ جو ذات النطاقین کے لقب سے مشہور ہیں ان کے اندر ہر وہ فاضلانہ وصف موجود تھا جو ایک عورت کے اندر بیٹی، بیوی اور ماں ہونے کی حیثیت سے ہونا چاہیئے۔

اپنے والد کے ساتھ ایمان لائیں۔ ہجرت کو پوشیدہ رکھنے میں جان تک خطرہ میں ڈال دی اور آنحضرتؐ کی ہجرت کے وقت زاد راہ کا پورا انتظام خود اپنے ہاتھوں سے کیا۔ سامان باندھنے کے لیئے جلدی میں کوئی چیز نہ ملی تو اپنے نطاق (پٹکہ) کو پھاڑ کر دو ٹکڑے کیئے اور اس سے سامان باندھا اسی وقت سے ذات النطاقین کے لقب سے موسوم ہوئیں۔

شادی زبیر بن عوام سے ہوئی جن کے پاس نہ مال و منال تھا، نہ چراگاہ نہ پانی کا گھاٹ۔ شوہر کے گھوڑے کو خود ہی چارہ ڈالتیں، خود ہی پانی کھینچنے والے اونٹ کے لیئے گٹھلیاں توڑتیں۔ اونٹ پانی کھینچتا تو خود ہی ڈول پکڑ کر پانی انڈیلتیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گذر اوقات کے لیئے جو باغ دو میل کے فاصلے پر عنایت فرمایا تھا۔ اس سے گٹھلیاں جمع کرکے خود ہی اپنے سر پر رکھ کر گھر لاتیں۔ اسی حالت میں زندگی کے ایام گذرتے رہے کہ اتفاقاً ایک دفعہ باپ کو بیٹی کی اس مشقت آمیز زندگی کا علم ہو گیا اور انھوں نے ازراہ عنایت ایک خادمہ مرحمت فرمادی۔ اس طرح ایک

خاتون طویل عرصہ تک اپنے گھر اور شوہر کی خدمت کرتی رہی۔ حالانکہ وہ ابو بکرؓ کی بیٹی، زبیر کی بیوی اور اسلام کے بطلِ عظیم عبداللہ کی ماں تھی۔

بیٹا مکہ میں محصور ہو گیا اور لوگوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا حتیٰ کہ اعزہ و اقارب اور اولاد تک کنارہ کش ہو گئے۔ بنو امیہ نے اس کو امان اگوزری اور مال و دولت کی پیش کش کی۔ بیٹا ماں کے پاس گیا اور اس نے یہ صورتِ حال ماں کے سامنے ان الفاظ میں بیان کی "میرے ساتھ اتنے کم لوگ رہ گئے ہیں کہ تھوڑی دیر بھی مقابلہ جاری نہیں رہ سکتا۔ دشمنوں نے میرے سامنے وہ سب کچھ پیش کر دیا ہے جس کا میں خواہشمند تھا۔ آپ کیا دائے دیتی ہیں؟"

اس خاتون نے یہ بات سنی اور ایک عورت —— وہ بھی ماں —— ہوتے ہوئے بھی ذرا دیر کے لئے خوف یا کمزوری کا شکار نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس موقع پر اگر صنادیدہ ابطال بھی کمزوری دکھا جاتے جب بھی قابلِ معافی سمجھے جاتے۔ اس خاتون نے اپنے دل کو بھی سنبھالے رکھا اور بیٹے کے دل کو بھی ڈھارس دی۔ اس نے بیٹے کو جس جرأتمندانہ انداز میں جواب دیا، اس کا اسلوب ملاحظہ ہو۔

فرمایا "بیٹے! اگر تم اس سے پہلے حق پر تھے تو اب بھی اسی حق پر قائم

رہو۔ تمہارے دوسرے ساتھی اسی حق کی خاطر مارے جا چکے ہیں۔ تم اپنی گردن بنو امیہ کے چھوکروں کے ہاتھ میں نہ دو کہ وہ تم کو کھلونا بنا لیں۔ اگر اس وقت تم یہ کہو کہ میں حق پر تھا مگر جب میرے ساتھی کمزور پڑ گئے، تو میری نیت و ارادہ بھی کمزور پڑ گیا، تو ایسا کہنا آزادوں اور بھلے مانسوں کا شیوہ نہیں۔ آخر تم اس دنیا میں کب تک رہو گے۔ زبیرؓ کا لخت جگر جس چیز پر قناعت کرنے کا خواہشمند ہے، قتل ہو جانا اس سے بہتر ہے۔ بخدا! عزت کے ساتھ تلوار کی ضرب سہہ لینا ذلت کے کوڑے کھانے سے بہتر ہے۔"

آپ نے اوپر جو تقریر ملاحظہ فرمائی وہ اس ماں کی تقریر ہے جس کا سن سو سال سے تجاوز کر چکا تھا جس پر ہر قسم کے مصائب نے ہجوم کر رکھا تھا۔ جو غم کی وجہ سے بصارت بھی کھو چکی تھی اور جو اپنے بیٹے کی زندگی سے بھی مایوس ہو چکی تھی۔ اس بڑھاپے، اس مرض و غم اور لخت جگر سے محرومی کے اس احساس کے باوجود اس نے جو بار گراں اٹھایا اس کو صنادید ابطال کے آہنی عزائم بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔

دشمن اس کے جانباز بیٹے پر فتح پا گئے۔ اس کو پھانسی کی سزا دی اور لاش کو توہین اور عبرت کے لئے برسر عام لٹکا دیا۔ ماں کو جس طرح یہ منظور نہ تھا کہ بیٹا ذلیل زندگی قبول کرے، اسی طرح اس کو اس بات سے

بھی دکھ ہوا کہ موت کے بعد بیٹے کی لاش کی بے حرمتی کی جائے۔ چنانچہ وہ راستہ پوچھتے پوچھتے اپنا رہبر ساتھ لئے حجاج کے پاس پہنچی اور اس سے فرمایا: "کیا ابھی اس شہسوار کے اترنے کا وقت نہیں آیا؟"

حجاج نے بڑے کرخت اور بے شرمی کے لہجہ میں کہا "کون سوار؟ یہ منافق؟"

ماں اس وقت حاجتمند بن کر گئی تھی مگر اس کو اس وقت یہ پروا نہ ہوئی کہ وہ (حجاج) اس کی مراد پوری کرتا ہے یا نہیں بلکہ صرف یہ فکر رہی کہ بیٹے کی مدافعت کرے اور شاتم کی بدگوئی کا دو بدو جواب دے۔ غصے میں آ کر فرمایا: "واللہ! وہ منافق نہ تھا۔ واللہ! وہ منافق نہ تھا۔ بلکہ روزہ دار اور شب زندہ دار تھا۔"

حجاج نے اس بے باک جواب پر برافروختہ ہو کر کہا: "تم اتنی بوڑھی ہو چکی ہو کہ تمہاری عقل ٹھکانے نہیں رہی ہے۔"

ماں نے کہا: "ایسا نہیں ہے۔ میرے ہوش و حواس قائم ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ ثقیف سے ایک کذاب اور ایک غارت گر اٹھے گا۔ کذاب تو ہم نے پہلے ہی دیکھ لیا، غارت گر تم ہو۔"

یہ وہ ماں ہے جس پر بیٹے بھی فخر کر سکتے ہیں اور باپ بھی۔ بلکہ ایسی

ماں آدم و حوا کی پوری نسل کے لئے باعثِ فخر و ناز ہے۔

یہ ہیں اسماءؓ بنتِ ابی بکرؓ۔

اور وہ تھیں عائشہؓ بنتِ ابی بکرؓ۔

اس گھر کی تعریف کن الفاظ میں کی جائے جس نے اس پایہ کی دو خاتونوں کو جنم دیا ہو۔

حضرت ابو بکرؓ کے لڑکے بھی اعاظم رجال میں شمار ہوتے ہیں لیکن کسی گھر کی صحیح تصویر لڑکوں سے زیادہ لڑکیوں کے مطالعہ سے سامنے آتی ہے لڑکوں کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی زندگی گھر کے علاوہ دوسرے ماحول سے متاثر رہی ہو گی لیکن لڑکیوں کے ہونہار اور بلند پایہ ہونے کا فخر صرف اور صرف اس گھر کو حاصل ہوتا ہے جس میں وہ جنم لیتی اور پروان چڑھتی ہیں۔ یہ ہے حضرت صدیقؓ کا گھر اور ایسا گھر جس سے اشرف و اکرم گھر چشمِ فلک نے نہیں دیکھا۔

اجمالی خاکہ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کچھ لوگوں کی زبان سے اپنے باپ کے متعلق ناروا باتیں سُن کر غصے سے فرمایا۔

"——— وہ بازی لے جانے والے برق رفتار گھوڑے کی طرح اس وقت بھی تم سے پیش پیش تھے، جب تم تردد کا شکار تھے۔ وہ نوجوانی کی حالت میں قریش کے ہونہار نوجوان تھے۔ پختہ عمر کو پہنچ کر دانائے قریش تھے۔ قریش کے اسیروں کو آزاد کرتے تھے۔ قریش کی تعریف و توصیف کرنے والے کو انعامات و اکرامات سے نوازتے تھے۔ قریش کے رخنوں کو دور کرتے اور اس کے شیرازہ بند تھے۔ یہاں تک کہ دلوں کی زینت بن گئے۔ پھر خدا کے دین میں اس طرح منہمک ہوئے کہ فنافی اللہ ہو کر رہ گئے۔"

مہاجرین و انصار میں سے کچھ لوگ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے در دولت پر اصحاب فضل کے فضائل کا تذکرہ کر رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برآمد ہوئے اور دریافت فرمایا "تم لوگ کیا باتیں کر رہے ہو۔"

لوگوں نے عرض کیا "ہم فضائل کا تذکرہ کر رہے ہیں۔"

۱۲ آپ نے فرمایا "ابو بکرؓ پر کسی کو مقدم نہ کرنا۔ وہ دنیا و آخرت دونوں میں تم سب سے زیادہ افضل ہے۔"

۱۳ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ "ابو بکرؓ بہترین انسان ہے۔ صرف اتنی کسر ہے کہ نبی نہیں ہے۔"

۱۴ حضرت علیؓ نے موت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے فرمایا:-

"آپ اس پہاڑ کی مانند تھے جس کو نہ آندھیاں ہلا سکتی تھیں اور نہ طوفان متزلزل کر سکتا تھا۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مطابق جسمانی لحاظ سے کمزور تھے مگر خدا کے معاملہ میں انتہائی طاقتور تھے۔ متواضع اور خاکسار تھے مگر خدا کی نظر میں عظیم المرتبت۔ زمین میں جلیل القدر اور مسلمانوں کی نگاہ میں بلند و بالا تھے۔ کوئی شخص آپ سے کوئی طمع نہ وابستہ کر سکتا تھا۔ کوئی شخص آپ سے رواداری کی امید نہ کر سکتا تھا۔ قوی آپ کی

نگاہ میں ضعیف تھا تا وقتیکہ اُس سے حق وصول نہ کر لیں۔ ضعیف آپ کے نزدیک قوی تھا تا وقتیکہ اس کا حق نہ وصول کر لیا جائے اللہ تعالیٰ ہمیں آپ کے اجر سے محروم نہ کرے اور آپ کے بعد گمراہی سے محفوظ رکھے۔"

اس تعریف و توصیف میں اتنا کافی مواد موجود ہے جتنا قریب سے جاننے والوں کی تعریف و توصیف میں تصور کیا جا سکتا ہے۔

مگر حضرت صدیقؓ تو ان عظیم شخصیتوں میں تھے جن کی تعریف و توصیف میں اگر دشمن بھی بخل کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ ہمیں کسی بھی حلقے سے کوئی ایسی بات سننے میں نہ آئے گی جس سے آپ کی فضیلت و عظمت پر معمولی حرف بھی آ سکے۔

کسی بھی عظیم انسان کے بارے میں مختلف لوگوں کا مختلف خیالات رکھنا اور اس کے اعمال کی تاویل کرنے والوں کا مختلف انداز میں توجیہہ کرنا ایسی بات نہیں جس سے اس پر کوئی حرف آتا ہو۔ دنیا کے ہر عظیم انسان کے کچھ لوگ موافقت کرنے والے ہوتے ہیں اور کچھ مخالفت کرنے والے۔ کچھ لوگ اس کو اچھی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور کچھ لوگ بری نیت سے۔ لیکن اس سے اس کی عظمت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اور نہ یہ کوئی نئی چیز ہے۔ اصل پیمانہ موافقت کرنے والے یا مخالفت کرنے والے کی دلیل ہے نہ کہ وہ بات جو وہ کہہ رہا ہو

ہر شخص کسی کے متعلق جو گمان بھی چاہے رکھ سکتا ہے۔لیکن اس خیال کی وقعت صرف اس وقت ہو گی جب وہ دلیل کے پیمانے میں پورا اترے اور حالات و واقعات اور اعمال و کردار بھی اس کی تائید کر دیں۔ اختلاف کرنے والوں کے اختلافات کو دیکھتے وقت یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیئے۔

حضرت ابو بکرؓ کی یہ فضیلت نہیں ہے کہ انہوں نے تمام لوگوں کی تعریف و توصیف حاصل کر لی اور ان پر کوئی تنقید کرنے والا نہ رہا۔کیونکہ یہ ناممکن ہے بلکہ آپ کی فضیلت یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کی تعریف و توصیف کے مستحق ضرور ٹھہرے جن کی تعریف و توصیف وزنی اور مبنی بر صداقت تھی۔جن لوگوں نے مخالفت کی ان کی مخالفت بلا دلیل رہی۔اور پھر یہ مخالفت ایسے لوگوں کیطرف سے کی گئی جو کبھی کوئی معقول بات کہنے کے عادی نہیں رہے۔

(حضرت ابو بکرؓ کے متعلق آخری بات جو دلیل کے ساتھ اور واقعات کی روشنی میں کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ ایک امین بلکہ امین سے بھی بڑھ کر اگر کوئی لفظ ہو تو اس کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔آپ امین تھے اور اس لئے امین تھے کہ جاہلیت اور اسلام کسی بھی دور میں خیانت نہیں کی۔امین سے بھی بڑھ کر اس لئے تھے کہ امین تو صرف امانت واپس کر دیتا ہے اور بس لیکن جو شخص امانت کے ساتھ ساتھ اس کی اجرت بھی مزید مال و دولت کی صورت میں ادا کرے۔اس کو اگر امین سے بھی بڑھ کر کوئی لقب نہ دیا جائے تو اور کیا

کیا جائے؟

حضرت ابو بکرؓ زمانہ جاہلیت میں امانتیں ادا کرتے رہے اور اس کے ساتھ مزید مال و دولت بھی بطور احسان دیتے رہے۔)

پھر امانت کبریٰ یعنی خلافت آپ کے سپرد کی گئی۔ دنیا سے رخصت ہوتے وقت اس امانت کو بھی مزید اضافہ کے ساتھ واپس کیا۔

(اگر ہم یہ کہیں کہ آپ نے اخلاق و زندگی کی امانت کے معاملہ میں بھی امین ہی ہونے کا ثبوت دیا تو یہ بھی حقیقت ہی ہوگی۔ آپ جس حالت میں پیدا ہوئے اس سے بہتر حالت میں مرے بقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نحیف و ناتواں ساخت پائی اور اپنی باطنی قوت سے ظاہری قوت کی تکمیل کی۔ اپنی مروّت سے اپنی وضعداری پر پرتو ڈالا اور خود اپنے اندر سے ایسی شخصیت پیدا کر لی جو جسمانی شخصیت سے مختلف اور اس کی ترقی یافتہ صورت تھی۔ آخرش ہیبت و جلال کے اس مقام پر پہنچ گئے جو اس قسم کی ساخت والوں کو میسّر نہیں آیا کرتا۔)

لوگ آخر کیوں ایسے شخص کے حوالہ اپنی امانتیں نہ کرتے جب کہ انہیں یہ یقین تھا کہ وہ جو کچھ دے رہے ہیں مزید اضافہ کے ساتھ واپس آجائے گا۔ زندگی آخر اپنی امانت کیوں ایسے شخص کے سپرد نہ کرتی جب کہ اس کو یہ یقین تھا کہ اس کی عطا کردہ امانت اضافے کے ساتھ واپس آجائے گی۔ ہر امانت

خواہ اس کا دینے والا کوئی ہو محفوظ و مصئون تھی بلکہ "سود" پر چلنے والا مال تھی۔
جو اصل مال کے ساتھ نفع بھی لاتی تھی۔
آپ کا اجمالی خاکہ یہ ہے کہ آپ امین تھے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔
(دوستی و صداقت میں امین تھے، حکومت میں امین تھے۔ سیرت و کردار
میں امین تھے، ایمان میں امین تھے بلکہ ہر معاملہ میں امین سے بڑھ کر تھے
فطری اسباب نے گمراہی کے فتنے سے محفوظ رکھا۔ شریف پیدا ہوئے بڑوں
میں عزیز بن کر رہے اور کمزوروں پر ظلم و طغیان سے واسطہ نہ رکھا۔
بڑے بوڑھے ہوئے مگر ڈکٹیٹر شپ سے دامن داغدار نہ ہوا اور نہ
لوگوں پر زبردستی تسلط جمانے کی کوشش کی۔
بوڑھے ہو گئے مگر شعور کی حرارت، یقین کے جوش، مروت اور فاداری
اور گرویدگی رسولؐ میں کوئی فرق نہ پڑا۔
بوڑھے ہوئے اور ہر فضیلت بڑی ہو کر اپنی انتہا کو پہنچ گئی جب
وفات پائی تو ہر پہلو سے ایک عظیم انسان کی صورت میں۔
وفات پائی اور اس شان کے ساتھ کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا سہرا
سر پر تھا۔
نبیؐ کے بعد ہر چیز میں ثانی رہے۔ قبول اسلام میں ثانی، خلافت
سنبھالنے میں بھی ثانی، اسلامی دعوت کو حیات نو بخشنے میں ثانی۔ ہر معاملہ

میں ثانی مگر اتباع و اقتدار اور لبیک کہنے میں اول تھے)

اس شخصیت کی اٹھان اس انسانی دعوت کے اندر سے ہوئی تھی جو ایک قوم کے اندر پروان چڑھی اور جس نے رفتہ رفتہ تمام اقوام کو اپنے محیط میں ضم کر لیا۔ یعنی اس دعوت سے جو ان کے دوست اور نبی محمد صلوات اللہ علیہ کی دعوت تھی۔

کہا جاتا ہے کہ وفات زہر کے اثر سے ہوئی جو ایک سال پہلے کھانے میں دے دیا گیا تھا لیکن یہ روایت اس قابل نہیں کہ ایک محقق اس پر توجہ دے سکے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وفات بخار سے ہوئی جو ایک سرد دن میں غسل کرنے کے باعث ہو گیا تھا۔ مگر عربی مہینوں کا شمسی مہینوں سے تقابل کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وفات کا مہینہ گرم رہا ہوگا۔ اس لئے یہ روایت بھی اتنی قوی نہیں کہ اس کو صحیح ہی مان لیا جائے (اغلب یہ ہے کہ ہجرت مدینہ کے وقت جو ملیریا بخار آپ کو ہو گیا تھا وہی بڑھاپے میں عود کر آیا اور وہ زندگی اس دنیا کو خیرباد کہہ گئی جو بشرف ومجد اور تاریخ کا کمال طے کر چکی تھی۔)

له اگست ۶۳۴ء

Madam Bawse

صدیقِ کاملؓ

ABDUL WAHEED.

مصنفہ

عباس محمود العقّاد

مترجم

منہاج الدین اصلاحی

ناشر

ایم ثناء اللہ خاں اینڈ سنز

۲۶ ریلوے روڈ۔ لاہور